ماہنامہ
بیداری
حیدرآباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
۴۰۰- بی لطیف آباد۴- حیدرآباد
E.Mail
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03363039299

جلد سترواں ◯ دسمبر۔ جنوری ۲۰۲۱ء
قیمت: ۲۵ روپے، سالانہ: ۳۰۰ روپے

اہم تفسیری نکات (مستقل سلسلہ)	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۲
(اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)	محمد موسیٰ بھٹو	
دیارِ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کو درپیش خطرات	اوریا مقبول جان	۱۱
جنسی آزادی کے	اوریا مقبول جان	۲۲
شوقین معاشروں کی حالت زار		
زندگی کا رخ متعین کرنے میں	محمد موسیٰ بھٹو	۲۵
عشق ومحبت کا کردار		
تجدد کے نام پر مغرب کی تقلید کی دعوت	مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	۴۵
مولانا حکیم امیر الدین مہر مرحوم	ڈاکٹر شہزاد چنا	۵۱
ہندوستاں میں انتہا پسند ہندو تنظیم کی سرگرمیاں	مولانا سید عنایت اللہ ندوی	۵۶
علمی طبقات کے کرنے کا کام	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۶۵
مصیبتوں اور مشکلات سے	شمس الحق ندوی	۷۵
صلاحیتوں کا ابھرنا		
بندہ مؤمن کا نصب العین	شمس الحق ندوی	۷۷
قاصد روم اور حضرت عمرؓ	مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ	۷۹

پبلشر: محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ ۴۰۰
بی لطیف آباد-۴- حیدرآباد سے شائع کیا۔ ٹیلیفون: 3861864 (022)

مولانا اشرف علی تھانویؒ
محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

اہم تفسیری نکات

(اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)

وَاجْعَلْنِیْ مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۸۵)
(اور مجھ کو جنت نعیم کے مستحقوں میں کر)۔

جنت سے بے نیازیانہ روش پر تنقید

یہاں ان لوگوں کی تردید ہے، جو بڑی بے نیازی سے کہتے ہیں کہ ہمیں جنت کی طلب نہیں، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ سے جنت کی دعا کررہے ہیں، لیکن اگر کوئی غلبہ حال کی بنا پر کہے تو ایسا فرد معذور ہے۔

تشریح:

اللہ کی زیارت جنت میں ہی ہوگی، اس لئے بندہ مؤمن جنت سے بے نیازی کی روش اختیار نہیں کرسکتا، ہاں ایسا صوفی جن کا ذہن تجلیات کے شدید زیر اثر ہوتا ہے، وہ اپنی شخصیت کے احساس سے بھی معدوم ہوجاتا ہے، اسے اس معاملہ میں معذور سمجھا جائے گا، جنت کے حوالے سے اس طرح کے صوفیاء کی باتوں کی حیثیت شطحیات سے زیادہ نہیں ہوتی، حقیقی صوفی کو جنت اس لئے مطلوب ہوتی ہے کہ وہاں اللہ کا دیدار ہوگا، نہ کہ جنت بذات خود مقصود ہوتی ہے، مغلوب الحال فرد جو یہ روش اختیار کرتا ہے، وہ حالت معذوری کی وجہ سے قابل معافی ہے، اس لئے کہ حالت سکر نے اس کے شعور کو متاثر کردیا ہے۔ (مرتب)

قَالَ رَبِّیْ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۸۸)
(شعیب بولے کہ تمہارے اعمال کو میرا رب خوب جانتا ہے)۔

کرامات کے صدور کا اللہ کے حکم سے ہونا

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کرامات اہل اللہ کے اختیار میں نہیں۔

تشریح:

کرامات، صوفی کا اپنا ذاتی کمال نہیں ہوتا، اور نہ ہی یہ بات اس کے اختیار میں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت جب اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ لوگوں کو صوفی سے استفادہ کے حالات مہیا کئے جائیں یا کوئی حکمت مقصود ہوتی ہے تو صوفی سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے، حقیقی صوفی کا دل کرامات نہیں چاہتا، اس لئے کہ وہ اپنی بزرگی کی شہرت سے ڈرتا رہتا ہے۔ (مرتب)

فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِيْنَ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۱۵۷)

(اور انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا پھر جب آثار عذاب کے نمودار ہوئے تو اپنی حرکت پر پشیمان ہوئے)۔

گناہ سے توبہ کے ساتھ ساتھ اس کی تلافی کا ہونا بھی ضروری ہے

حکیم الامت کے الفاظ اس طرح ہیں: ان کی اس ندامت کے نافع نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے فعل (گناہ کی) تلافی ایمان سے نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ توبہ میں طبعی ندامت کا ہونا کافی نہیں، بلکہ عقلی ندامت بھی چاہئے۔

حافظ عبدالرحیم صاحب نے حاشیہ کا مفہوم اس طرح پیش فرمایا ہے۔

جب کسی گناہ سے توبہ کی جائے تو اس کی تلافی بھی کی جائے، مثلاً اطاعت الٰہی میں سستی ہوگئی ہو تو پوری تندہی سے اس میں مشغول ہوا جائے، اگر حقوق العباد میں کمی بیشی کی ہے تو انہیں ادا کرے یا معاف کرائے، اور صرف طبعی طور پر کسی کے کہنے پر گناہ نہ چھوڑے، بلکہ ذہنی طور پر بھی اس گناہ سے توبہ کرے۔

تشریح:

گناہ سے توبہ کے بعد اگر اس کی تلافی کی صورت بھی پیدا ہو تو اس سے نیکی کی راہ پر چلنا آسان ہوجاتا ہے اور بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا زیادہ فضل اور اس کی توجہات

شامل ہوجاتی ہیں، مثلاً ذکر میں سستی واقع ہوگئی، اس میں ناغہ ہوگیا تو اس کے نتیجہ میں قلب پر تاریکی پیدا ہوگئی (ہر گناہ قلب میں تاریکی پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے) اب توبہ کے ساتھ ساتھ اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ ذکر کی مقدار بڑھائی جائے اور چھوٹ جانے والا ذکر بھی کیا جائے، تاکہ نفس کو یہ عمل شاق گزرے، اور آئندہ وہ اس طرح کی حرکتوں اور غفلتوں سے باز آجائے، اسی طرح اگر کسی فرد سے قصور ہوا ہے تو توبہ کے ساتھ ساتھ اس سے معافی بھی طلب کی جائے۔ (مرتب)

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِيْنُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. (سورۃ الشعراء، آیت نمبر۱۹۳۔۱۹۴)

(اور ان کی (ایک امانتدار فرشتہ (جبرائیل) لے کر آیا ہے۔ تمہارے دل پر تو جیسے تم آدمیوں کو اللہ کی عذاب سے خبردار کرنے والوں میں سے ہو)۔

اولیاء کو ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ باطنی بصیرت کا حاصل ہونا

اولیاء اللہ کو ظاہری سماعت وبصارت کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے باطنی سماعت وبصارت سے بھی نوازا جاتا ہے، جس سے ان پر ورود قلبی ہوتا ہے، اور اسرار وحکم کو دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ان کے ایمان میں اور زیادہ ترقی ہوتی ہے۔

تشریح:

اہل اللہ کے علم کا مرکز قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ دل کی گہرائیوں میں موجود اللہ کی تجلیات بھی ہوتی ہیں، دل جب پاک وصاف ہوجاتا ہے تو دل پر قرآن وسنت میں موجود انوار کا ورود ہونے لگتا ہے اور اہل اللہ کے دل کو علوم سے آشنا کیا جاتا ہے، جس سے عام طور پر عقل قاصر ہوتی ہے، عالم ربانی چونکہ مجاہدوں کے ذریعہ دل کو نفس کی یرغمالی سے بڑی حد تک آزاد کرچکا ہوتا ہے، اس لئے اس کے دل پر عجیب وغریب معارف وحقائق کا ورود ہوتا رہتا ہے، دینی معاملات اور زندگی کے مسائل میں اس کی رائے کی صحت کے امکانات قوی سے قوی تر ہوجاتے ہیں، اسے حکمت، بصیرت اور فراست عطا کی جاتی ہے، اس کی زکاوت حس بڑھ جاتی ہے، وہ چونکہ نفسی قوتوں اور نفس کی ہزارہا واردات سے گزرچکا ہوتا ہے، اس لئے انسانی نفسیات، شخصیت اور افراد کے حالات ومزاج کے

بارے میں اس کی تشخیص بڑی حد تک صحیح ہوتی ہے، اسے باطنی بصیرت عطا فرمائی جاتی ہے۔ (مرتب)

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهاً آخَرَ فَتَكُونَ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۲۱۳)

(سو تم اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت مت کرنا کہ کبھی تم کو سزا ہونے لگے)۔

ولی سے شرعی تکالیف معاف نہیں ہوسکتی

اس میں تصریح ہے کہ ولی کبھی ایسے درجہ پر نہیں پہنچتا، جس میں اس سے شرعی تکالیف ساقط ہوجائیں، کیونکہ ولی کا درجہ نبی پر فائق نہیں، پھر جب نبی کے لئے یہ جائز نہیں تو ولی کے لئے کیسے جائز ہوگا۔

تشریح:

ولایت کا کوئی درجہ ایسا نہیں، جہاں اسلامی شریعت اور فرائض وواجبات معاف ہوتے ہوں، بلکہ ولی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کی وجہ سے اللہ اسے اپنے قرب کا مقام عطا کرتا ہے، شریعت کے منافی اعمال کرنے والے فرد کو ولی کہنا ہر اعتبار سے غلط ہے، چاہے اسے کتنا ہی کشف حاصل ہو اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے اور راغب کرنے کی کتنی ہی استعداد حاصل ہو، ولایت، اعمال صالحہ اور اسلامی شریعت لازم وملزوم ہے، ولی کا اصل کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو فروغ دیتا ہے، اللہ کی اطاعت پر زور دیتا ہے، لوگوں کی تربیت کے ذریعہ انہیں اسلامی اعمال کا حامل بناتا ہے، نیز ان کا تزکیہ کرتا ہے، جو فرد اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہو، وہ ولی نہیں ہوسکتا، حال سے معذور افراد قابل معافی ہیں، نہ کہ قابل تقلید۔

اس طرح کے معذور لوگوں کو دیکھکر حقیقی اہل اللہ سے اعراض (دوری اختیار کرنا) اپنی اصلاح وتزکیہ کے کام کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ (مرتب)

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ . (سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۲۱۵)

(اور ان لوگوں کے ساتھ (مشفقانہ) فروتنی کے ساتھ پیش آیئے جو مسلمانوں میں داخل ہوکر آپ کی راہ چلیں)۔

مربی کے لئے نرمی وتواضع کا ہونا ضروری ہے

اس میں شیوخ کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے مخلص تابعین سے نرمی وتواضع کے ساتھ پیش آیا کریں، تاکہ وہ مسرور ہوں۔

تشریح:

شیخ اپنے متعلقین کے لئے بڑا شفیق ہوتا ہے، وہ راہ محبت میں چلنے کی وجہ سے انہیں اپنے دل کے ٹکڑے کی حیثیت دیتا ہے، وہ ان سے محبت کرتا ہے اور ان سے آخری حد تک نرمی کا معاملہ کرتا ہے، البتہ جس طالب کی اصلاح کی کوششوں کے باوجود وہ اصلاح کے سلسلہ میں آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، وہ ذکر کے دورانیے میں اضافہ نہیں کرتا، اپنی شکل وصورت اسلام سے ہمہ آہنگ نہیں کرتا، اس پر شیخ سخت اذیت محسوس کرتا ہے، اگر شیخ کی برسوں کی صحبت کے باوجود طالب کی اصلاح نفس کی حالت میں ارتقا نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا طالب اصلاح کے سلسلہ میں زیادہ سنجیدہ نہیں، وہ شیخ سے محض برکت کی خاطر وابستہ رہنا چاہتا ہے، یہ بات شیخ کے لئے رنجیدگی کا سبب ہوتی ہے، شیخ کے دل میں اپنے ساتھ وابستہ افراد ہی کے لئے نہیں، بلکہ سب کے لئے محبت وشفقت کے جذبات موجود ہوتے ہیں، وہ سب کی سعادت دارین کا خواہشمند ہوتا ہے، بلکہ وہ اس کا حریص ہوتا ہے۔ (مرتب)

إِذْ قَالَ مُوسَى لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَاراً سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ. (سورۃ النمل، آیت نمبر ۷)

(جب کہ موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے، میں ابھی وہاں سے کوئی خبر لاتا ہوں، یا تمہارے پاس آگ کا شعلہ کسی لکڑی وغیرہ میں لگا ہوا لاتا ہوں، تاکہ تم سینک سکو)۔

بسا اوقات صاحب کشف کا اپنی کشف کی حقیقت سے ناآشنا ہونا

بسا اوقات صاحب کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور وہ کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی تجلی کو ایک عام آگ سمجھ لیا، حالانکہ

وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی تجلی تھی۔

تشریح:

کشف کی حقیقت کو سمجھنا بعض اوقات بہت دشوار ہوجاتا ہے، بالخصوص مبتدی یا متوسط صوفی کو بہتر کشف ہو تو اس پر وہ اللہ کے انعام کا شکر ادا کرے، کشف کی حقیقت یا نوعیت معلوم کرنے یا مزید کشف کی آرزو اور اس کے انتظار میں رہنا وقت ضایع کرنے کے مترادف ہے، اصل چیز ذکر میں استقامت ہے، اگر یہ استقامت حاصل ہوجائے اور ایک بھی کشف حاصل نہ ہو تو یہ زیادہ بہتر حالت ہے، اس لئے کہ کشف کی صورت میں مبتدی ومتوسط طالب کی توجہ ذکر سے ہٹنا شروع ہوجاتی ہے۔ (مرتب)

إِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر۱۰)

(اے موسیٰ ڈرو نہیں ہمارے حضور میں پیغمبر ڈرا نہیں کرتے)۔

تقویٰ کے نتیجے میں غیر اللہ کا نکل جانا

انبیاء، اللہ کے غیر سے نہیں ڈرا کرتے، کیونکہ ان پر اللہ تعالیٰ کا خوف غالب ہوتا ہے (اللہ کی شان عظمت کی وجہ سے) ایسے ہی، جو کوئی چاہتا ہے کہ اسے غیر اللہ کا قطعاً خوف نہ ہو تو اسے چاہئے کہ اللہ کی پکڑ اور عذاب سے ڈر کر زندگی گزارے۔

تشریح:

اللہ کا خوف اور آخرت کی فکرمندی ایسی چیز ہے، جو بندہ مومن کو دنیا کے خوف وہراس سے بلند کردیتی ہے، آخرت کے خوف کی وجہ سے بندہ مومن پر یہ فکر غالب رہتی ہے کہ آگ میرا انتظار کررہی ہے، زندگی کے یہ لمحات جو مجھے ملے ہیں اس لئے ملے ہیں، تاکہ ایسے اعمال کروں، جس سے اس آگ سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو، اللہ کے عتاب کا خوف بندہ مومن (اہل اللہ) کے ہوش وحواس اڑانے کا موجب بن جاتا ہے، جس فرد کی آخرت کے سلسلہ میں حساسیت کی یہ حالت ہو، اسے دنیا کے ڈر اور خوف کیا کرسکتے ہیں، اللہ اور آخرت کا خوف ہی وہ چیز ہے، جو فرد کو دنیا کی ہیبت سے بلند کرنے کا ذریعہ ہے، اگر فرد پر اس نکتہ کا استحضار ہو تو اس کے لئے دنیا کے سارے مسائل آسان ہوجائیں، اور دنیا کے حوالے سے اس کی ساری فکرمندی اگر ختم نہ بھی ہو تو حد اعتدال میں ضرور رہے گی۔ (مرتب)

وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر۱۵)

(ان دونوں (داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام) نے کہا کہ تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے سزاوار ہے جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی)۔

کاملین کی حالت بھی تغیر وتبدل سے خالی نہیں ہوتی

کاملین بھی ایک حالت پر نہیں رہتے، بلکہ ان میں بھی اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، کبھی تو اپنے آپ کو بالکل معدوم خیال کرتے ہیں اور کبھی اپنے تمام کمالات گنوا دیتے ہیں، اور ان کمالات کا اظہار فخر وغرور کے طور پر نہیں ہوتا، بلکہ اظہار تشکر کے طور پر ہوتا ہے۔

تشریح:

کاملین کے حالات میں تغیر وتبدل بشریت کا لازمی نتیجہ ہے، بڑے سے بڑا اہل اللہ بھی کیفیات میں ادل بدل اور احساسات کے تغیر اور دلی طور پر اتار چڑھاؤ کے حالات سے محفوظ نہیں رہتا، البتہ ان کے حالات میں تغیر وقتی اور ہنگامی نوعیت کا ہوتا ہے، اکثر ان کے مزاج میں ٹھہراؤ ہوتا ہے، کاملین اگر اپنے مجاہدات یا اپنی طبیعت کی بہتری کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مقصود طالبوں میں ذوق وشوق پیدا کرنا ہوتا ہے، نہ کہ اپنے مجاہدوں وصفات پر ناز کرنا پیش نظر ہوتا ہے، کاملین پر بعض اوقات خوف کی حالت زیادہ غالب ہوتی ہے، حالات میں تغیر اللہ کی سنت ہے، دن کے بعد رات کا آنا، سردی کے بعد گرمی کا آنا، صحت کے بعد بیماری کا آنا، ان ساری چیزوں میں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ (مرتب)

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ. (سورۃ النمل، آیت نمبر۲۴)

(میں نے اس کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں مرغوب کر رکھا ہے اور ان کو راہ سے روک رکھا ہے سو وہ راہ پر نہیں چلتے)۔

جانوروں اور چرند وپرند میں ایک حد تک عقل ومعرفت کا ہونا

ہدہد کی یہ تقریر اس پر دلیل ہے کہ جانوروں اور چرند پرند کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ضرورت کے موافق اتنی عقل ومعرفت عطا فرمائی ہوئی ہے کہ جس سے وہ اشیاء کو سمجھ اور پہچان سکیں۔

تشریح:

جانوروں اور چرند وپرند سب میں ان کی حیثیت وضرورت کے مطابق عقل وشعور موجود ہوتا ہے، اس شعور کی وجہ سے ہی وہ زندگی کی بقا کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اگر ان میں شعور نہ ہو تو ان کی زندگی مشکل ہوجائے، ہدہد کا حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک مشرک قوم اور ان کی بادشاہ خاتون کی اطلاع دینا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جانوروں میں کافی زیادہ شعور ہوتا ہے، لیکن انسان کو جو شعور حاصل ہے، اتنا شعور مخلوق میں کسی اور کو حاصل نہیں، اس شعور کی وجہ سے ہی وہ اعمال کے جواب دہ ہیں۔ (مرتب)

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ . (سورۃ النمل، آیت نمبر ۷۰)

(اور آپ ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ شرارتیں کررہے ہیں، اس سے تنگ نہ ہوں)۔

وعظ ونصیحت اور لوگوں سے رابطے میں اعتدال سے کام لینا

جو وعظ وارشاد کے فریضہ میں مشغول ہو اور اس کی بنا پر لوگوں سے میل جول رکھنا پڑے تو اس میں بھی میانہ روی اور اعتدال سے کام لینا چاہیے۔

تشریح:

وعظ وتلقین پر فائز فرد کو اس کام میں اعتدال قائم رکھنا ضروری ہے، ہر وقت لوگوں سے ملنا، وعظ ونصیحت یا گفتگو کرتے رہنا، ہر وقت دوسروں کی اصلاح کی فکرمندی کا ہونا، یہ اعتدال کے منافی ہے، اس سے دل وروح کی تشنگی میں اضافہ ہوتا ہے، دل وروح کی غذا ہی محبوب کا ذکر ہے، جب غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہوتی ہے، تو

ایک طرف اخلاص وللھیت میں فرق واقع ہوجاتا ہے، دوم دل میں اضطراب پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے، بعض اہل اللہ پر ہر وقت ذکر کی کیفیت غالب رہتی ہے، یہ اگرچہ بہتر کیفیت ہوتی ہے، تاہم اللہ کے بندوں کو ان کی اصلاح کے لئے وقت دینا بھی ضروری ہے، ورنہ افرادِ معاشرہ کی اصلاح کا عمل بری طرح متاثر ہوگا۔ (مرتب)

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ . (سورۃ النمل، آیت نمبر ۷۹)

(سو آپ اللہ پر توکل رکھئے یقیناً آپ صریح حق پر ہیں)۔

حق پر قائم ہونے سے ہر طرح کے سکون کا حاصل ہونا

جو فرد حق پر قائم ہوتا ہے، اس کا دل ودماغ بالکل مطمئن ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا توکل وبھروسہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کے برعکس جو حق پر قائم نہیں ہوتا، اس کے دل میں روز بروز وسوسے وشبہات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

تشریح:

حق پر استقامت سے قائم رہنے والا فرد دلی اور ذہنی سکون سے سرشار ہوتا ہے، ذکر وعبادت کے مجاہدے اور شریعت پر استقامت اس کی باطنی حالت کو مستحکم سے مستحکم تر کردیتی ہے، ایسے افراد کا اللہ کی ذات پر یقین میں اضافہ پر اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، انہیں دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی، وہ سکون، سکینت اور حلاوت کی ایسی حالت میں رہتے ہیں، جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، جب کہ ذکر وعبادت، مخلصانہ اطاعت سے محروم افراد اکثر پریشان رہتے ہیں، ان کا دل ہر وقت اضطراب سے دوچار ہوتا ہے، اس طرح ان کے لئے یہ زندگی ایک طرح سے عذاب بن جاتی ہے۔ (مرتب)

دیارِ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کو درپیش خطرات

مسلمانوں کی اس سیکولر جمہوری اور لبرل ملک میں اوقات ہی کیا ہے۔ تم ساٹھ لاکھ مسلمانوں کا وہ جم غفیر ہو، جسے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ''پانی پر بہتے ہوئے خس وخاشاک'' سے تعبیر کیا ہے۔ تمہیں بہت زعم تھا کہ تم فرانس میں نو فیصد ہو اور تمہارے ووٹ کی جمہوری نظام میں اہمیت ہے۔ یہ والٹیئر، وکٹر ہیوگو اور سارتر جیسے فلسفیوں اور سیاسی دانشوروں کی دی گئی سیکولر اخلاقیات کا فرانس ہے۔ ان کے انقلاب کو انقلابات کی ''ماں'' کہا جاتا ہے۔ اسی کی کوکھ سے جمہوریت، سیکولرازم اور لبرل ازم نے جنم لیا۔ مذہب کو ''خونی عفریت'' بنا کر نو دسمبر ۱۹۰۵ء کو ریاست کے کاروبار سے علیحدہ کر دیا گیا اور فرانس پر نسل، زبان، رنگ اور علاقے کا پرچم لہرا دیا گیا۔ مذہب کاروبارِ سلطنت سے رخصت ہو چکا تھا، اب سیکولر لبرل دعوؤں کے مطابق دنیا امن کا گہوارہ بن جانی چاہیے تھی۔ کاش کوئی آج بھی فرانس میں رہنے والوں سے سوال کرے کہ ۱۹۰۵ء کے بعد تم پر نسل، زبان، رنگ اور علاقے کے نام پر دو عالمی جنگیں کیسے مسلط ہو گئیں۔ تمہارے شہر اجڑے، مرد، عورتیں اور بچے قتل ہوئے۔ اتنے قتل کہ پوری انسانی تاریخ میں کل ملا کر بھی اتنے لوگ نہیں قتل کیے گئے ہوں گے۔

اس قتل وغارت کے باوجود بھی کسی نے فرانس کے طرز زندگی (Life Style) یعنی سیکولر، جمہوری اور لبرل اقدار پر انگلی تک نہیں اٹھانے دی۔ جس نے اٹھائی، اسے جمہوری اکثریت کی آمریت نے کچل کر رکھ دیا۔ جمہوریت کی اکثریت کی نافذ کردہ آمریت کے مقابلے میں فرانس کے نو فیصد یا ساٹھ لاکھ مسلمانوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔ سب کے سب دہشت گرد، شدت پسند اور جرائم پیشہ ہیں۔ کتنی بڑی قیمت چکا رہے ہیں، وہ مسلمان جو صرف فرانس میں نہیں، بلکہ پورے یورپ اور امریکہ میں رہتے ہیں۔ اس کا اندازہ آج پیرس کی سڑکوں پر گزرتے

ہوئے اس مسلمان کو ضرور ہوتا ہوگا جو صبح فجر کی نماز میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر درود پاک پڑھ کر نکلتا ہوگا اور اسے ہر دوسرے چوراہے پر بڑی بڑی عمارتوں پر اسی نبی محترم کے خاکے نظر آتے ہوں گے اور سر جھکا کر گزر جاتا ہوگا۔

یورپی یونین کے ۲۹ ممالک آپس میں ایسے منسلک ہیں جیسے کراچی سے لیکر پشاور تک موٹروے سے سارا ملک منسلک ہوتا ہے۔ آپ ناروے یا سویڈن سے بھی جرمنی یا فرانس آنا چاہیں تو پوری کی پوری ٹرین ایک بڑے سے بحری جہاز میں منتقل کر دی جاتی ہے اور یہ بحری جہاز ٹرین کو اگلے ساحل پر اتار دیتا ہے۔ ان تمام ممالک میں گھومنے پھرنے کے لئے آپ کو کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں، گاڑی نہیں بدلنی پڑتی، کرنسی نہیں تبدیل کروائی پڑتی۔ ان تمام ممالک میں تقریباً دو کروڑ ستر لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ اسی یورپی یونین کے ۲۹ ممالک سے دس لاکھ افراد گیارہ جنوری ۲۰۱۵ء کو چارلی ہیبڈو کے ان خاکے بنانے والوں کے ساتھ اپنی عصبیت (Solidarity) کا اظہار کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے، ان کا ساتھ دینے کے لئے یورپ، امریکہ اور ایشیا سے چالیس سربراہانِ مملکت، دنیا بھر کے اداکار، ادیب، شاعر اور گلوکار سب پیرس آئے تھے۔ مسلمان حکومتوں میں سے ترکی کا وزیر اعظم احمد وغلو، اردن کا شاہ عبداللہ، فلسطین کا محمود عباس، متحدہ عرب امارات کا عبداللہ بن زید، مالی کا ابراہیم بجار، تیونس کا مہدی جمعہ اور لبنان کے جبران باسل جیسے نمائندے بھی شامل تھے۔

کیا المیہ ہے کہ آج پیرس کی دیواروں پر توہین آمیز خاکوں کے خلاف اپنے وغم وغصے کے اظہار کے لئے یورپی ممالک میں آباد پونے تین کروڑ مسلمانوں میں سے چند ہزار بھی وہاں جمع نہیں ہو سکے۔ یہ مسلمان دس لاکھ تو کیا، ایک لاکھ بھی جمع ہو جاتے تو آج نقشہ عجیب ہوتا۔ ان یورپی مسلمانوں کو تو کوئی ویزہ نہیں لینا تھا۔ یہ اگر اکٹھے ہوتے تو شاید دنیا بھر سے مسلمان کھلاڑی، ادیب، شاعر، حکمران سیاستدان بھی ان کی حمایت میں وہاں جانے کے لئے تیار تو ہو جاتے۔ بیشک انہیں اجازت نہ ملتی، لیکن دنیا بھر میں ایک طوفان ضرور کھڑا ہو جاتا۔ فرانس انہیں آنے سے روکتا تب رسوا ہوتا، آنے دیتا تو اور تماشہ لگتا۔ یورپ میں آباد مسلمان بقول افتخار

عارف ''سگِ زمانہ''ہیں، جو نہ تو اپنے ملکوں میں ستائے گئے تھے اور نہ ہی ان پر کبھی عرصۂ حیات تنگ ہوا تھا۔ کوئی اکا دکا جان کا خطرہ پاکر سیاسی حالات کی وجہ سے یہاں ضرور آیا ہوگا۔ لیکن باقی تو سب فقط تلاش رزق میں یہاں آئے۔ وہ بھی فاقہ زدگی سے تنگ آکر نہیں، بلکہ رزق کی موجودگی میں مزید بہتر حالات کی تلاش میں یہاں پہنچے۔ مسلمانوں کے کسی ملک، شہر یا گاؤں میں فاقہ زدگی کا عالم نہیں تھا۔ اپنے کھیت کھلیان اور کاروبار مزدوریاں چھوڑ کر یہ لوگ یورپ پہنچے۔ اس معاشی ہجرت کی جو قیمت ان لوگوں نے ادا کی ہے اس کی کہانیاں سنانے لگوں تو کئی دنوں تک شام غریباں کا سماں طاری رہے۔ ان میں سے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسے مسجد میں جاکر نماز پڑھنے کی اجازت ہے تو یہ سب سے بڑی رعایت ہے، جو اسے میسر آچکی ہے۔ لیکن اس رعایت کے بدلے جو نسلیں پروان چڑھیں ہیں، انہوں نے آج سے پچاس سال پہلے ہی والدین کو پاگل کر دیا تھا۔ برطانیہ کے شہر بریڈ فورڈ میں ۱۹۶۹ء میں ایک نفسیاتی مریضوں کا ہسپتال کھولا گیا جس کا نام psychiatry Trans cultural unit of تھا اس ہسپتال میں مسلمانوں خصوصا پاکستانیوں کو رکھا جاتا ہے، جو دولت کمانے یہاں آئے اور جب انکی اولاد جوان ہوگئی اور وہ مغرب کی اخلاقیات میں رچ بس گئی تو انہیں دیکھ کر ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ گھرانوں کے گھرانے اور نسلوں کی نسلیں ایسی برباد ہوئیں کہ ہر کوئی ایک دوسرے سے منہ چھپانے لگا۔

دنیا کے کسی بھی تحقیقی ادارے، خصوصا PEW کی ریسرچ رپورٹیں اٹھالیں، انہیں پڑھ کر آپ کے پاؤں تلے زمین نکل جائیگی۔ ہجرت کرنیوالے مسلمان برباد ہوئے تو ایسے کہ یورپ میں پیدا ہونے والی جسم فروش عورتوں میں ان کی اکثریت ہوگئی اور ان میں جو کامیاب ہوئے تو ایسے کہ انہیں اپنا دین، مذہب سب چھوڑنا پڑا۔ مسلمان جن ممالک میں جمہوری طور پر ممبران پارلیمنٹ تھے، اور اگر وہاں ہم جنس پرستی کی شادی کا بل پیش ہوا تو انہوں نے پارٹی کی پالیسی کے تحت اس کیلئے ووٹ دیا۔ اسی پیرس میں جنوری ۲۰۱۴ء کو جب پریڈ کے دوران ہم جنسی شادی کے حق میں پٹیشن پر دستخط ہو رہے تھے تو سات ہزار مسلمان ایکٹیوسٹ نے بھی دستخط کیے تھے۔ ایسے مسلمانوں کی موجودگی میں کارٹون بنائے جائیں، توہین رسالت کی جائے، سب روا ہے،

کیونکہ وہ خود کو مسلمان نہیں بلکہ ''فرانسیسی طرز زندگی French Life Style کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ یہ خاکے دراصل نفرت کی ایک علامت ہے۔ آسیہ مسیح کی تصویر کا بہت بڑا بینر پیرس شہر کی میونسپل کمیٹی کی عمارت پر کئی سال تک لہراتا رہا اور پیرس کے مسلمان اس کے سامنے معمول کے مطابق گزرتے رہے۔ کسی نے کبھی سوچا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ آسیہ مسیح کس بات کی علامت تھی۔ توہین رسالت کی علامت تھی۔ یورپ کے مسلمان شہریوں کو بتانا مقصود تھا کہ اگر کسی پر تمہارے نبی کی توہین کا ''صرف الزام'' ہی آجائے وہ ہمارے لئے اتنا باعزت بن جاتا ہے کہ اس کا بینر ہم کئی سال تک پیرس کی میونسپل کمیٹی کی بڑی عمارت کے باہر لگائے رکھتے ہیں۔ ورنہ آسیہ مسیح کا پیرس کے لائف سٹائل سے کیا تعلق۔ یہی رویہ ہے کہ جس استاد کی وجہ سے یہ ہنگامہ کھڑا ہوا، جس نے کلاس میں رسول اکرم کے کارٹون اظہار رائے کے نام پر دکھائے تھے اور اسے ایک چیچن مسلمان نے قتل کیا، اسے فورا فرانس کے سب سے بڑے اعزاز Legion of honour سے نوازا گیا۔

سیکولر، لبرل اور جمہوری معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہر ظلم کو کوئی نہ کوئی خوبصورت نام دے کر اس کی سرپرستی اور وکالت کرنے لگتے ہیں۔ فرانس اور یورپ میں بیسویں صدی کے آغاز یعنی، ۱۹۰۰ء کے بعد سے قائم ہونے والے سیکولر، لبرل اور جمہوری معاشرے، دو انتہائی خونی اور نفرت انگیز اجتماعی تعصب کے ادوار سے عبارت ہیں۔ پہلا دور یہودیوں کے خلاف تھا، جسے ''سامیت کے خلاف'' (Antisemitism) کہا جاتا ہے۔ یوں تو یہودیوں سے نفرت صدیوں سے عیسائی معاشرے کا حصہ رہی ہے، لیکن یہ نفرت اپنے عروج پر ان جمہوری ادوار میں ہی پہنچی۔ علم و عرفان اور تحقیق کے دروازے کھلے تو یورپی ممالک کی تمام جمہوریتوں اور بادشاہتوں میں نسلی برتری کی ایک تھیوری بہت مقبول ہوئی، جس کے تحت سفید نسل کو ایک برتر نسل قرار دیا گیا اور یہودیوں کو کمتر۔ کہا گیا کہ یہودی اگر عیسائیت قبول بھی کر لیں، تب بھی وہ ''پسماندہ'' ہی کہلائیں گے۔ ۱۹۰۳ سے ۱۹۰۶ء تک کے تین سال وہ ہولناک عرصہ ہے جب یورپ کی ''جمہوری اکثریت'' نے ''یہودی اقلیت'' کے ساتھ خون کی ہولی

کھیلی۔ یہودی اپنے طور پر یہ سمجھ رہے تھے کہ اب چونکہ ''عیسائی مذہب''، ریاست سے علیحدہ ہو گیا ہے اور سیکولر حکومتیں وجود میں آ گئیں ہیں اِس لیئے ہم بھی سکون میں آئیں گے، لیکن اس کے برعکس ان کے گھروں اور دکانوں پر اجتماعی حملے شروع ہوئے، تو انہوں نے دفاع کے لیئے ہتھیار اٹھا لیئے، لیکن بیچارے بری طرح کچلے گئے۔ یورپ کے ۶۴ شہروں میں یہودیوں کا بے دردی سے قتل عام ہوا۔ جنگ عظیم کی شکست کے بعد، جرمنی کے الیکشنوں میں ہٹلر کی تاریخی جیت نے ان یہودیوں پر ''ہولوکاسٹ'' کے قتل عام کے دروازے کھول دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں رہنے والے یہودیوں میں سے ۶۰ فیصد قتل کر دیئے گئے۔ لاتعداد محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ نفرت دراصل ۱۹۳۰ء کی کساد بازاری کے دوران یہودی تاجروں کے مستحکم ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ چونکہ ان کا معیشت پر کنٹرول ہو گیا تھا، اس لیئے رد عمل میں ان کا قتل عام کیا گیا۔ انہی سیکولر، لبرل اور جمہوری معاشروں کی دوسری نفرت انگیز اور خونی پہچان ''اسلاموفوبیا'' (Islamophobia) ہے۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں سے نفرت بھی صدیوں پرانی ہے۔'' عیسائی یورپی دنیا، یہودیوں کو حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھانے کا مجرم سمجھتی ہے اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی ''بیت المقدس'' کی فتح، آج تک ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ طویل اور کئی صدیوں پر محیط صلیبی جنگیں انہیں یورپی ممالک نے لڑیں، ''بیت المقدس'' میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پھر ''صلاح الدین ایوبی'' کے ہاتھوں ''متحدہ مسیحی یورپ'' کی افواج کی ذلت آمیز شکست ایک ایسا زخم ہے جو آج بھی رستا رہتا ہے۔

''اسلاموفوبیا'' کے الفاظ سب سے پہلے ہی نومولود سیکولر، لبرل فرانس کے مشہور مصور، الفانسے ڈاینٹ Alphonse Dinet کی لکھی گئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری میں استعمال ہوئے، جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ سوانح عمری جب انگریزی میں ترجمہ ہوئی تو اسلاموفوبیا کی بجائے ''ضرر رساں اسلام'' Inimical Islam کے الفاظ استعمال کیئے گئے۔ اسلاموفوبیا، مسلمانوں سے نفرت، یورپ معاشروں میں مسلمان بحیثیت

ایک بگاڑ کی علامت، جیسے تصورات سے اس دور کے یورپ کے ناول، افسانے، فلسفے کی کتابیں، مضامین اور شاعری کے مجموعوں سے بھرے پڑے ہیں۔ فرانس نے ۱۹۰۵ء میں جب سیکولر، لبرل طرز حکومت اپنایا تو صرف ایک سال بعد ہی اس کے ''نوآبادیات کے محکمے'' Colonial Department کے سربراہ نے ۱۹۰۶ء میں ایک سرکاری رپورٹ شائع کی، جس کا عنوان تھا Islamic Threat: Myth or Reality (اسلامی خطرہ: افسانہ یا حقیقت)۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں سے یہ نفرت ۱۹۱۷ء میں روس میں آنے والے ''کمیونسٹ بالشویک انقلاب'' کی وجہ سے دب گئی۔ پوری سرمایہ دارانہ کارپوریٹ دنیا، ''کمیونزم'' کے خوف سے اسقدر کانپ رہی تھی کہ اس نے اپنی تمام نفرتوں کو بھلا کر صرف اور صرف کمیونزم کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے لے کر سویت یونین کے خاتمے تک کے پینتالیس سال ایک خوفناک سرد جنگ کا عرصہ ہیں۔ یہ ویت نام، کیوبا، انگولا، جنوبی امریکہ کے ممالک اور ہند چینی کے علاقے میں قتل وغارت گری کا ایک طویل دور ہے۔ یہ دور ختم ہوا تو سیکولر، لبرل اور جمہوری یورپ نے اپنا ایک صدی پرانا ''اسلاموفوبیا'' کا ہتھیار نکالا اور چند سالوں میں مسلمانوں کو دنیا بھر میں بدنام کر کے رکھ دیا۔ آج یہ ہتھیار خاص طور پر یورپی دنیا کے مسلمانوں کے خلاف انتہائی شدت کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔

سیکولر، لبرل اور جمہوری معاشروں کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ہر ظلم کو محترم اور باعزت Glorify بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ جب یہودیوں کے خلاف ''ہولوکاسٹ'' کی قتل وغارت جاری تھی تو یہودیوں کو تہذیب دشمن اور ملک کے غدار ثابت کرنے میں پورا مغربی معاشرہ مصروف تھا۔ یہودیوں سے منسوب ''پروٹوکولز'' Protocols جسے صہیونیت کی ''بانی دستاویز'' کہا جاتا ہے، انہیں ۱۹۰۳ء میں خاص طور پر چھاپا گیا اور پھر اسے ویسی ہی نفرت کی کتاب قرار دیا گیا، جیسے آج قرآن پاک کے بارے میں ہرزہ سرائی کی جاتی ہے۔ یہودیوں کو یورپ کے سیکولر، لبرل اور جمہوری معاشرے کے لیئے ایک ایسا خطرہ قرار دیا گیا، جو ایک دن ان کی معیشت، سیاست اور معاشرت پر قبضہ کر لے گا اور پھر اس خوف کو ہتھیار بنا کر ہر شہر میں

یہودیوں کا قتل عام جائز قرار دیا گیا۔ اسی جدید سیکولر، لبرل اور جمہوری یورپی معاشرے کو جب اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کو باعزت اور محترم بنانا مقصود تھا، تو پھر اس مقصد کے حصول کیلئے ایسی تمام آوازوں کو دبانا بھی بہت ضروری تھا، جو اسلام کے حق میں بولی جا سکتیں تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ یہ بھی دکھانا تھا کہ ہم تو ''آزادیٔ اظہار'' Freedom of Speech کے قائل ہیں۔ یوں نفرت انگیز ماحول بنانے کے خلاف دو نئے تصورات تخلیق کیئے گئے اور عوام میں مقبول بھی کروائے گئے۔ ایک ''طرزِ زندگی'' Life Style کی بقا کی جنگ اور دوسرا ''نفرت انگیز گفتگو'' Hate Speech۔ یورپی طرز زندگی کو کسی سکھ کی پگڑی سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا، عیسائی راہبہ Nun کی Hud (ہڈ) بھی غلط نہیں، لیکن ''مسلمان کی داڑھی'' اور ''عورت کا حجاب''، ان کی طرز زندگی پر حملہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس ظالمانہ تصور کے خلاف اگر کوئی مسلمانوں، اسلام اور اسلامی اقدار کے حق میں آواز بلند کرنا چاہے تو ان یورپی ملکوں میں ''جمہوریت کی اکثریت'' سے قائم ایک ظالمانہ اور آمرانہ ''جمہوری'' نام فورا ''نفرت انگیز گفتگو'' Hate Speech کے نام کئے گئے جرم میں اسے قید کر سکتا ہے، اسکی زبان بندی کی جا سکتی ہے، جرمانے اور شدید سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

اس کے برعکس طرز زندگی Life Style کی حفاظت کے لیئے اور اس کی سربلندی کے لیئے اگر کوئی آرٹسٹ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ کارٹون بنائے تو سیکولر، لبرل اخلاقیات اور آزادیٔ اظہار کے نام پر اس کا تحفظ کیا جاتا ہے۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے ممالک کی طرز زندگی کو خوف Threat کس سے ہے۔ کیا پوری دنیا کے ستاون اسلامی ممالک میں، دنیا میں بسنے والے ایک ارب پچاس کروڑ مسلمان ان کے لیئے خطرہ ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ ستاون اسلامی ممالک تو ایسے ہیں جن کے اکثر ممالک میں خود سیکولر، لبرل اور جمہوری حکمران ہیں، یا پھر چند ایک میں قدیم بادشاہتیں ہیں۔ مراکش سے لے کر ملائیشیا تک اکثر جگہ جمہوری طور پر، منتخب ''آئینی'' نظام قائم ہے اور سیاستدان، یورپ کے طرزِ زندگی کو اپنا آئیڈیل تصور کرتے ہیں۔ ''اسلاموفوبیا'' تو

دراصل ان مسلمانوں کے لیئے ہے، جو یورپ میں آباد ہیں، اور انہیں دن بدن یورپی معاشروں کے لیئے پریشانی اور خطر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مسلمان گذشتہ بیس سالوں سے ایک ایسا ''جزیرہ'' بن چکے ہیں جو یورپی معاشرے میں بالکل الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ دنیا کے سب سے معتبر تحقیقی ادارے PEW نے ۲۰۱۷ء میں ان یورپی مسلمانوں کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی، جس کا عنوان تھا، Europe,s Growing Muslim Population (یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی)۔ اس رپورٹ کے مطابق اگر آج یورپ کے تمام دروازے مسلمانوں کے لیئے بند بھی کر دیئے جائیں تو بھی یورپ میں مسلمانوں کی آبادی کو مسلسل بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایسا کیوں ہے؟

مغربی دنیا کو اس بات سے قطعا کوئی دلچسپی نہیں کہ توہین رسالت یا توہین مذہب کی ''وارداتوں'' کا مسلم دنیا پر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ پوری مسلم دنیا ایسی ''قومی ریاستوں'' کا مجموعہ ہے، جو آئینی اور عملی طور پر جمہوری، سیکولر اور لبرل حکومتیں ہیں۔ ان تمام اسلامی ممالک میں دیکھنے کو تو مسلمان رہتے ہیں، لیکن ان کی بودوباش، طرز تعلیم، معیار قیادت اور معیشت و معاشرت سب کی سب ''سیکولر'' اور ''جمہوری'' ہے۔ برونائی سے لے کر مراکش تک جہاں کہیں بھی الیکشن ہوتے ہیں، وہاں وضع قطع سے ہی اگر کوئی شخص مسلمان نظر آتا ہو تو عوام سے اپنے لیئے قائد کے طور پر منتخب کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان جیسا ملک کہ واحد ایسی ریاست جو ''کلمۂ طیبہ'' کے نام پر قائم ہوئی، وہاں کا سیکولر اور لبرل دانشور بھی پوری دنیا کے سامنے سینہ پھلا کر کہتا اور تحریروں میں لکھتا ہے کہ پاکستان میں کبھی شرعی قوانین نافذ نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہاں کا ووٹر ہر الیکشن میں نیک، پارسا، تہجد گزار، دیانتدار، اور اسلامی اصولوں پر کاربند امیدواروں کو بری طرح مسترد کرتا ہے اور سیکولر، لبرل، بددیانت، چور، اٹھائی گیر، رسہ گیر، منشیات فروش، ذخیرہ اندوز اور بودوباش سے ''مغرب زدہ'' نظر آنے والے کو منتخب کرتا ہے۔ تیل کی دولت سے مالا مال مسلمانوں کے آسودہ حال ممالک میں شروع دن سے ہی ایسی بادشاہتیں قائم کی گئیں، جن کے اقتدار کو دوام، امریکہ اور یورپی

ممالک کی تھپکی اور عسکری مدد سے ملتا ہے۔ یوں دنیا پر ایک ایسی مسلم امہ وجود در کھتی ہے، جس میں ملائیشیا، انڈونیشیا، پاکستان، سوڈان اور تیونس جیسی سیکولر، لبرل جمہوری حکومتیں ہیں، متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین، کویت اور مسقط جیسی سیکولر، لبرل اور آزاد خیال بادشاہتیں ہیں، عراق اور افغانستان جیسی امریکی افواج کی سرپرستی میں قائم جمہورتیں اور ایران اور سعودی عرب جیسی نیم مذہبی، اور مجموعی طور پر نسلی تفاخر پر قائم سلطنتیں ہیں۔ اب ایسی مسلم اُمت سے کونسا مغرب ڈرے گا، قرضوں میں جکڑی ہوئی، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ایشین بینک کی محتاج، عالمی مالیاتی کاغذی کرنسی اور سودی معیشت میں لتھڑی ہوئی۔ ان کے سربراہوں میں غیرت و حمیت کہاں سے آئے گی، انہیں سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت سے کیا سروکار۔ کارٹون یورپ میں چھپتے ہیں اسلامی ملکوں کا میڈیا ان کی خبر سے اپنا چورن بیچنے کے لیئے یہاں نشر کرتا ہے، کچھ دن ہنگامے برپا ہوتے ہیں، توڑ پھوڑ ہوتی ہے، گستاخ ملک کے مال کے بائیکاٹ کی مہم چلتی ہے، سفیر کو بلا کر احتجاج ریکارڈ کروایا جاتا ہے اور پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد سب زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ ''رات گئی، بات گئی'' والا معاملہ ہو جاتا ہے اور سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔ ایسے خاکے بار بار چھپے اور بار بار بس اتنا ہی اور اتنی ہی دیر ''ردعمل'' نظر آیا۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے ''بحیثیت اُمت'' ہماری محبت اور عشق کی اتنی ہی معراج ہے۔ مسلمانوں میں سے کسی شخص نے اگر کبھی کسی دوسرے شخص کو ماں، باپ یا بیٹی کی گالی پچاس سال پہلے بھی دی ہو اور وہ شخص اس کی پہنچ سے دور ہو، وہ کچھ نہ کر سکتا ہو، مگر اس کا سینہ اس دکھ، درد اور کرب سے پچاس سال کھولتا رہے گا۔ وہ کبھی گالی بھولے گا اور نہ ہی دینے والے کی شکل۔ دنیا کو اب تقریباً یقین ہو چلا ہے کہ یہ سب مسلمان ملکوں کے عوام کا وقتی اُبال اور غصہ ہے اور بحیثیت اُمت ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ وہ اپنے نبی کو ماں باپ، اولاد، بہن، بھائیوں اور رشتے داروں سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔

مغرب ان خاکوں کو بنیادی طور پر اپنے اندر آباد مسلمانوں کی غیرت و حمیت اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے انکی محبت آزمانے کے لیئے شائع کرتا ہے۔ مغرب کو اندازہ ہے کہ یورپ

میں آباد پونے تین کروڑ مسلمان، باقی امت سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ یہ تو مغرب زدگی اور مفاد پرستی میں تو ان سے بھی آگے ہیں۔ ان کی اکثریت مغربی طرز زندگی (Life Style) میں ایسی ڈوب چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی، جو چند ایک مذہب کو سینے سے لگائے ہیں اور اس پر عملدرآمد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، انہیں حکومتیں اور عوام مل کر آسانی سے دہشت گرد اور شدت پسند ٹھہراتے ہیں۔ یہ وہ شدت پسند کہلانے والے یورپی مسلمان وہ ہیں، جو چنگاری کی طرح سلگتے رہتے ہیں اور کسی بھی دن ان چنگاریوں کی وجہ سے مغرب میں آباد مسلمانوں میں غیرت و حمیت کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ دنیا بھر کی رپورٹیں یورپ کو خوفزدہ کرتی ہیں کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی، ایک دن سب کچھ بدل کر رکھ دے گی۔ مانع حمل ادویات اور خاندانی زندگی سے بیزاری گورے کی آبادی زیادہ تر بوڑھوں پر مشتمل ہو چکی ہے۔ یہاں پیدا ہونے اور رہنے والا مسلمان اس معاشرے کی خامیوں، کمزوریوں اور مجبوریوں سے مکمل آشنا ہے۔ ایک جانب مسلمانوں کے خلاف گزشتہ پچاس سالوں سے بڑھتی ہوئی نفرت ہے اور دوسری جانب مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی۔ یہ صورت حال ایک دن ایک بڑا تصادم پیدا کر سکتی ہے۔ تحقیقی ادارے PEW کے مطابق دس سال پہلے یورپ میں مسلمان ایک کروڑ پچانوے لاکھ کے قریب تھے، یہ اب دو کروڑ پچھتر لاکھ ہیں اور ۲۰۵۰ء تک نو کروڑ سے زیادہ ہو جائیں گے، جبکہ اس وقت غیر مسلم آبادی اڑتالیس کروڑ ہو گی۔ ان اڑتالیس کروڑ میں بوڑھوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گی کہ بحیثیت مجموعی پلہ مسلمانوں کا بھاری ہو گا۔ یورپ کو ایسے کسی مسلمان سے کوئی خوف نہیں جو ہم جنس ساڈی کے لیئے ووٹ دیتا ہو، بغیر شادی کے اپنے پارٹنر کے ساتھ رہتا ہو اور سب رنگ ڈھنگ یورپ والے اختیار کرے۔ انہیں چارلی ہیبڈو کے کارٹون بنانے والوں کو قتل کرنے والوں اور چیچن نوجوان جیسے حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تن من دھن قربان کرنے والوں کی تلاش ہے۔ یورپ انہیں اور ان سے ہمدردی رکھنے والے یورپی مسلمانوں کو خوفزدہ کر کے اپنے '' لائف سٹائل'' میں مدغم کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیئے یہ خاکے شائع کیئے جاتے ہیں، حجاب پر پابندی لگائی جاتی ہے، مسجد کے میناروں کی اجازت نہیں ملتی، اذان دینے سے

منع کیا جاتا ہے۔ مقصد صرف ایک ہے کہ عبداللہ، عبدالرحمٰن اور ہیرس، ہاردی کے درمیان، صرف ناموں کے اور کوئی فرق باقی نہ رہے۔

یہ سب کچھ یہاں تک نہیں رکے گا۔ پوری امت جس دور میں داخل ہو چکی ہے، اسے ''آخرالزمان'' اور ''دور فتن'' کہا جاتا ہے۔ عیسائی اور یہودی بھی اس دور میں ہونے والی لڑائی سے باخبر ہیں اور سب اس کے لیئے کمربستہ ہیں۔ یہودی کی تیاری سب سے زیادہ ہے۔ عیسائی دنیا میں ''اینونجلسٹ'' (Evanglist) اور چند ایک دیگر گروہ اس میں تیزی لا رہے ہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی صدارت انہی گروہوں کی قوت کے اظہار کی علامت ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف یورپ میں آباد مسلمانوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی گئی ایک وارننگ پہنچانا مقصود ہے، جو کتاب الفتن کی ایک طویل حدیث میں دی گئی ہے۔ اس حدیث کے مطابق، اس بڑی جنگ کا آخری معرکہ شام کے علاقے حلب کے ساتھ ''میدان اعماق'' میں لڑا جائے گا، جس میں یورپ سے ۸۰ جھنڈوں تلے فوج آئے گی اور ہر جھنڈے تلے بارہ ہزار افراد ہوں گے۔

یہ ترکی کو روندتے، قسطنطنیہ کو فتح کرتے ہوئے اعماق کے میدان میں لڑیں گے، شکست کے بعد وہ مسلمانوں سے امان لے لیں گے۔ مگر ایک چال سے مسلمانوں میں افواہ پھیلائی جائے گی کہ ان کے پیچھے ملکوں میں دجال نکل آیا ہے۔ وہ اپنے علاقوں میں لوٹیں گے تو پتہ چلے گا کہ یہ جھوٹ ہے۔ اس کے بعد حدیث کے الفاظ میں ایک قتل عام کا ذکر ہے فرمایا ''رومی باقی ماندہ عربوں پر حملہ کر دیں گے، انہیں قتل کریں گے یہاں تک کہ روم کی زمین میں کوئی عربی مرد، نہ عورت اور نہ ہی عربی بچہ باقی رہے گا۔ سب قتل کر دیئے جائیں گے۔'' (کتاب الفتن: الاعماق وفتح القسطنطنیہ)۔ اس پر مسلمان غضبناک ہو کر لوٹیں گے اور پھر رومیوں کو شکست دے کر فتحیاب ہوں گے اور پھر قسطنطنیہ بھی واپس لیں گے۔ یورپ میں بسنے والوں کو خود بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ اگر یہی نفرت ایک دفعہ جنگ وجدل تک آ پہنچی تو پھر وہاں کا حال وہی ہو گا جو اسپین میں آباد مسلمانوں کا ہوا تھا۔

اوریا مقبول جان

جنسی آزادی کے
شوقین معاشروں کی حالت زار

ہم ایک ایسے عالمی اخلاقی منظر نامے میں سانس لے رہے ہیں جہاں عالمی ادارۂ صحت کے ماہرین سے لے کر انسانی ونسوانی حقوق کے علمبرداروں تک اور دو سو کے قریب قومی ریاستوں سے لے کر سماجیات، معاشرت اور اخلاقیات کے بڑے اداروں تک اس بات پر متفق ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ ایک لڑکی جو ''ٹینز'' (Teens) یعنی اپنی عمر کے تیرہ سال سے لے کر انیس سال تک کے عرصے میں ہے، اسے ہر طرح کے ناجائز جنسی تعلقات رکھنے، ان کے نتیجے میں بچہ پیدا کرنے، اس بچے کو عمومی طور پر محنت مزدوری کر کے تنہا پالنے کی تو اجازت ہے۔ لیکن کسی ملک میں والدین کو اس لڑکی کی کم عمری میں شادی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

ایک لڑکی اگر کسی ''ترقی یافتہ'' ملک میں اپنے طور پر بغیر نکاح کے رہنا شروع کر دے، اس دوران وہ ایک ناجائز اولاد کا بوجھ بھی اٹھا لے تو دنیا کا کوئی مغربی ملک یا مغرب زدہ دانشور اسے کسی قسم کی سزا کا حقدار قرار نہیں دیتا، بلکہ حکومتوں نے اس کے اس ''ناجائز'' تعلق کو آسان اور سہل (Facilitate) کرنے کے لیئے لاتعداد خدمات (Services) کی سہولت مہیا کر رکھی ہے۔ ''ٹین ایج'' کے دوران محبت میں گرفتار ہو کر جسمانی تعلق استوار کرنے والی لڑکیوں کو اس تعلق کی نفسیاتی اور جسمانی پیچیدگیوں سے آگاہ کرنے یعنی (Awareness) بہم پہنچانے کے لیئے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے سرگرم عمل ہیں، جو سب سے پہلے ان نوجوان جوڑوں کو محفوظ جنسی تعلقات (Safe sex) کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں، پھر انہیں شدت جذبات سے مغلوب لمحوں کے دوران اچانک ہونے والی اولاد کی نعمت سے بچنے کے لیئے مانع حمل ادویات وغیرہ کے بارے میں تفصیلا بتایا جاتا ہے۔ ایسے تعلقات استوار کرنے والی بچیوں کی نفسیاتی صحت کے تحفظ کے لیئے مشاورت ورہنمائی (Guidance and Counselling) کی سروسز کا ایک جال بچھایا گیا ہے۔ ان ''ناجائز'' تعلقات کی قلیل مدتی

کی وجہ سے ٹین ایج بچیاں جس طرح کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتی ہیں، ان میں خود اذیتی، ڈپریشن اور اضطراب سے لے کر خودکشی تک شامل ہیں۔

شادی کے بغیر قائم ان تعلقات کی ناپائیداری کی بنیادی وجہ بھی اکثر اوقات وہ اولاد ہی مورد الزام ٹھہرائی جاتی ہے، جو ان تعلقات کے نازک جذباتی مرحلے میں وجود میں آتی ہے۔ اگر یہ جوڑا اسے ہنسی خوشی اپنی محبت کی نشانی کے طور پر قبول کرلے تو زندگی مزید کچھ ماہ یا سال خوشگوار رہتی ہے، ورنہ اس اطلاع کے پہلے دن سے ہی اس بچے سے نجات کی کوششیں شروع ہوجاتی ہیں۔ اس ''نازک قتل'' کو بھی آسانی سے انجام دینے کے لیئے ''اسقاط حمل'' (Abortion) کی خدمات کا جال بچھایا گیا ہے۔ شفقت مادری کے فطری جذبات سے مغلوب ہوکر اگر کوئی لڑکی اپنے اس ''ناجائز'' بچے کو اکیلے پالنے کا ارادہ کرلیتی ہے تو کھلنڈرے محبوب کی بے وفائی کا سارا غصہ اسی معصوم پر نکلتا ہے۔ دنیا کے تمام مہذب مغربی ممالک میں بچوں پر تشدد (Child Abuse) کی بلند ترین شرح غیر شادی شدہ ٹین ایج ماؤں میں پائی جاتی ہے۔ ایسے ''ناجائز تعلقات'' کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کا مستقبل اس بات کا ''مرہون منت'' ہوتا ہے کہ کب ان کا والد، والدہ یا دونوں اسے چھوڑ کر اپنے اگلے سفر کی بانہوں میں باہیں ڈال دیں۔ ان حالات میں یہ معصوم کس کے رحم وکرم پر ہوگا۔ چونکہ ریاست نے اس ''اس ناجائز بچے'' کے دنیا میں آنے کے سارے عمل کو تحفظ دیا ہوتا ہے اس لیئے اس عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کی پرورش کے لیئے بھی لاتعداد اداروں کا جال بچھایا گیا ہے۔ جنہیں کہیں پناہ گاہیں (Shelters) تو کہیں پرورش گاہ (Foster Homes) اور کہیں تو براہ راست متروک بچوں کا گھر (Abandoned baby homes) کہا جاتا ہے۔ پوری ریاست، سول سوسائٹی، حقوق انسانی ونسوانی کے پہرے دار، سب کے سب مستعدی کے ساتھ ان تمام ''خدمات'' کی فراہمی کا بندوبست کرتے ہیں، جوان نوجوان ''لڑکے لڑکی کے باہم ناجائز'' تعلقات سے پیدا ہونے والی خرابیوں اور الجھنوں کو دور کرسکیں۔ لیکن کوئی شخص یا ادارہ ان تعلقات کی اخلاقیات، معاشرت، ماحول اور خاندانی اقدار کے بارے میں بحث کرتا نظر نہیں آتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب میں تعلقات کی پوری عمارت اس ایک اصول پر کھڑی ہے کہ ''ہر وہ جسمانی تعلق محترم، معزز اور قانونی ہے جو دونوں کی مرضی اور منشا سے وجود میں آتا ہے۔ یہ تعلق دس سال کی لڑکی اور لڑکا قائم کریں یا ستر سال کے بوڑھا

اور بوڑھی۔ یہ تعلق کسی سیکولر، جمہوری اور لبرل معاشرے میں جرم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے اس ''جرم'' کے نتیجے میں جو بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں انہیں اندیشے یا خطرات (Hazards) کہا جاتا ہے اور ان کی روک تھام یا ان کے اثرات سے نمٹنا بھی قانونی تصور ہوتا ہے۔

کم سن بچیوں کے ہاں بغیر شادی کے اولاد پیدا کرنے کے اعداد وشمار اتنے زیادہ اور خوفناک ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ ان ماؤں کی تعداد ایک چھوٹے سے براعظم کی آبادی کے برابر ہے۔ گیلپ ورلڈ پول (Gallup World Poll) کے مطابق اس وقت پوری دنیا، جس میں تمام براعظم شامل ہیں، ہر سو میں سے ۱۳ کمسن بچیوں کے گھر میں ایسے بچے موجود ہیں جو ان ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوئے اور ان کے ''والد محترم'' انہیں چھوڑ کر چلے گئے اور بیچاری مائیں انہیں پال رہی ہیں۔ یہ اعداد وشمار ایک سو چالیس ممالک سے حاصل کیئے گئے ہیں۔ ان تمام براعظموں میں صرف امریکہ اور کینیڈا ریجن میں ایسی اکیلی غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد ۱۹ فیصد ہے۔ یعنی ہر پانچویں بچی ایک ایسے ''ناجائز'' بچے کو پال رہی ہے، جس کا باپ اسے چھوڑ کر کسی دوسری محبوبہ کے قدموں میں اپنا دل نچھاور کرنے جاچکا ہے۔ جنوبی امریکہ کے ممالک میں یہ تعداد مزید خوفناک ہے، یعنی ۳۰ فیصد، یعنی ہر تیسری کمسن بچی ایسی اولاد پالتی ہے، جس کے خانہ ولدیت میں نام لکھنا بھی کئی ملکوں میں قانونی نہیں ہے۔ یہ خوفناک رجحان دنیا بھر میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔ امریکہ کے تمام تحقیقی ادارے غیر شادی شدہ ماؤں کے بارے میں جو اعداد وشمار جمع کرتے ہیں'' انہیں ایک ادارے (Child Trend data Bank) نے جمع کیا ہے۔ اس کے مطابق ۱۹۶۰ء میں غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد ۵ فیصد تھی جبکہ ۱۹۹۵ء میں یہ تعداد ۳۳ فیصد ہوگئی اور ۲۰۰۸ء میں ۴۱ فیصد ہوگئی۔ اس کے بعد کے بارہ سالوں کے اعداد وشمار ابھی تک میسر نہیں ہیں، لیکن اندازہ ہے کہ امریکہ کی ہر دوسری عورت ایک ''ناجائز'' بچے کو پال رہی ہے۔ اپنی مرضی سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کے لیئے ان مہذب ممالک میں عمر کی بھی کوئی پابندی نہیں۔

محمد موسیٰ بھٹو

زندگی کا رخ متعین کرنے میں
عشق ومحبت کا کردار

محبت اور عشق ایسی چیز ہے، جس سے زندگی کا رخ، اس کا مقصد اور اہداف متعین ہوتے ہیں محبت اور عشق صلاحیتوں، توانائیوں اور وقت کے استعمال کے سلیقہ سے آشنا کرتی ہے، فرد کو اپنی بیوی اور بچوں سے محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ ان کے لئے آٹھ دس گھنٹے کا وقت نکالنے سے بھی نہیں ہچکچاتا، عشق ومحبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ وقت، ذہنی اور جسمانی توانائیوں کو نچوڑنے کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ مادی نوعیت کی جائز محبت کے ساتھ ساتھ پاکیزہ نوعیت کی محبت کے جذبات کی تسکین کا بھی انتظام کرے، جب ان دونوں محبتوں کے درمیان توازن قائم ہوگا تو فرد کے سارے جذبات حسن کی تشفی وتسلی کی صورت پیدا ہوگی۔

مادیت کے غلبے کی وجہ سے اس وقت ہم صرف مادی نوعیت کے عشق ومحبت سے آشنا ہیں، جس کی وجہ سے ہماری شخصیت اور ہماری زندگی کا توازن بگڑ گیا ہے۔ انسان جسم کے ساتھ ساتھ روح اور روحانیت سے بھی عبارت ہے، روح اپنی خالق ہستی سے محبت کے والہانہ رشتہ سے جڑا ہوا ہے، روح کو محبوب حقیقی سے والہانہ محبت کے اجزاء سے بہرہ ور کئے بغیر ہمارے محبت کے پاکیزہ جذبات کی تشفی ہرگز نہیں ہوسکتی، اس موضوع پر تفصیل کے لئے ہماری ویب سائیٹ ملاحظہ کیجئے۔

روح جوہری چیز ہے، اس کا مادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، روح ہر وقت اپنی خالق ہستی کے بارے میں بے چین رہتی ہے، روح اپنی یہ بے چینی ذہن، نفسیات، اعصاب اور دل کی طرف منتقل کردیتی ہے، جس سے بہت ساری بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جس طرح جسم کو صحتمند رکھنے کے لئے مناسب خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ روح کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، روح کی یہ خوراک انوار حسن کے اجزاء سے بہرہ وری کی خوراک ہے، جس سے روح کے جذباتِ حسن کی تسکین ہوتی رہتی ہے، دوسری صورت میں روح بیمار ہو کر فرد کو

موت کے سے حالات سے دوچار کردیتی ہے۔

جدید انسان کی بے شمار نفسیاتی، ذہنی اور وجدانی نوعیت کی بیماریوں کا بنیادی سبب ہی یہ ہے کہ روح کو اس کی مطلوبہ غذا دینے کی ضرورت کا احساس باقی نہ رہا ہے۔

سچی روحانیت کا عملیات، وظائف، کشف کرامات اور جعلی اہل تصوف کی رسومات سے کوئی تعلق نہیں ہے، سچی روحانیت یہ ہے کہ فرد کا اپنے حقیقی خالق سے تعلق قائم اور مستحکم ہوجائے، اس مقصد کے لئے بزرگوں کے ہاں کچھ روحانی نوعیت کی مشقوں کا اہتمام رہا ہے، جس سے روح پر طمانیت کی حالت طاری ہوتی ہے اور روح اپنے احساسِ طمانیت کے کچھ اجزاء دل، دماغ، نفسیات اور اعصاب کی طرف بھی منتقل کرتی ہے، جس سے انسانی شخصیت میں ٹھہراؤ، توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اور وہ سارے انسانی اوصاف پیدا ہونے لگتے ہیں، جو انسانیت کا خاصہ ہیں۔

مراقبہ (میڈیٹیشن) کا اسلامی تصور

دنیا میں مراقبہ (میڈیٹیشن) کے بہت سارے طریقے رائج ہیں ان سارے طریقوں سے نفسیاتی طور پر ضرور کچھ فوائد مرتب ہوتے ہیں، لیکن اسلام میں مراقبہ کا تصور، ایسا ہے جو انسان کے سارے جذباتِ حسن کے تشفی کے لئے کافی وشافی ہے اور شخصیت میں ٹھہراؤ اور پاکیزگی پیدا کرنے میں بھی غیر معمولی طور پر معاون ومددگار ہے۔

مراقبہ کا اسلامی طریقہ دراصل دل کی دنیا میں انقلاب برپا کرکے، شخصیت میں موجود ہر طرح کے تلاطم کو ختم کرتا ہے اور شخصیت کو بے قراری وبے چینی کے انگاروں سے نکال کر، خوشی ومسرت وحلاوت کے لازوال احساسات سے سرشار کرتا ہے۔

اس طرح اسلامی مراقبہ ایک نئے پاکیزہ اور سب سے محبت کرنے والے انسان کو جنم دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔

مراقبہ سے شخصیت میں موجود حیرت انگیز قوتوں سے نہ صرف آشنائی ہوتی ہے، بلکہ ان قوتوں پر فتحیابی بھی حاصل ہونے لگتی ہے۔

موجودہ دور کے پیدا کردہ سارے مسائل، جس سے اس وقت انسان دوچار ہے، جن مسائل نے انسانی زندگی کو شدید بحران سے دوچار کیا ہے، ان سارے مسائل کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جدید انسان نے اندر میں غوطہ زنی کرکے، رحمانی قوتوں تک رسائی حاصل کرنے کے کام سے انکار کی روش اختیار کی ہے، جس کی سزا کے طور پر انسان کو بے رحم مادی قوتوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

اقبال کا شعر ہے

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

نوجوانوں کا مادہ پرست قوتوں کے زیر اثر ہونا

آج ہماری نوجوان نسل نہ چاہتے ہوئے بھی مادہ پرست قوتوں کی اثرات کی زد میں ہے اور مادے کی بے رحم طاقتیں ان کی زندگیوں کو زیر وزبر کررہی ہیں، مادی زندگی کو مقصود بنانے کے جو نتائج ظاہر ہورہے ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) دنیا کی محبت اور حرص کی نہ ختم ہونے والی دوڑ کا شروع ہونا (۲) اشتعال اور جھنجھلاہٹ میں اضافہ کا ہونا (۳) زندگی سے مایوسی وبے زاری کا ہونا (۴) مادی حسن پر فریفتگی کا ہونا (۵) ذہن اور دل میں جنسی خیالات وجذبات کی ہیجان خیزی کا پیدا ہونا (۶) پاکیزہ صفات اور نیک اعمال سے کراہت وبے زاری کا ہونا (۷) مادہ پرست اور خواہشات کے اسیر دوستوں کی صحبت کا ہونا (۸) نشہ آور چیزوں کا سہارا لینے کی کاوشوں کا ہونا (۹) اخلاقات سے عاری زندگی کا ہونا (۱۰) ادب وآداب اور اپنی پاکیزہ اقدار سے دوری وغیرہ۔

یہ کتنے بڑے نقصانات ہیں، جو مادی زندگی کو مقصود بنانے کا لازمی نتیجہ ہیں، اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے دنیا کی یہ زندگی بھی تلخیوں اور دکھوں کا نمونہ اور باعث ہے تو آخرت کی زندگی بھی۔

اس طرح کی صورتحال میں مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس بحران سے نکلنے کے لئے اپنے اندر حقیقی طلب اور امنگ پیدا کریں اور مادیت اور مادہ پرستانہ ماحول اور نفس پرستی کی قوتوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے فکر ونظر کو تبدیل کریں اور اسے درست کریں، اس کے بعد روحانیت کی وہ مشقیں شروع کریں، جو نفسی اور مادی قوتوں پر رحمانی وملکوتی قوتوں کو غالب کرنے کا ذریعہ ہیں۔

یقین جانیں ایسا کرنے سے آپ نہ صرف مادیت اور نفسی قوتوں کے خلاف حصار باندھنے میں کامیاب ہوں گے، بلکہ آپ کو خوشی ومسرت کی نئی زندگی بھی حاصل ہوگی، نیز آپ اپنے عزیز واقارب، دوست واحباب اور معاشرے کے لئے باعث خیر وبرکت ثابت ہوں گے۔

کامیاب زندگی کے لئے

تین چیزوں کی ضرورت

دنیاوی زندگی کو کامیاب، خوشگوار اور پاکیزہ بنانے کے لئے بالخصوص تین چیزوں کی ضرورت ہے، ایک مادیت اور نفسی قوتوں کی پیدا کردہ ظلمات یعنی تاریکی کے مقابلہ میں انوار الٰہی سے فیضیابی دوم مادی حسن پر فریفتگی کے بجائے معنوی اور حقیقی حسن کے اجزاء سے بہرہ وری سوم بے ہمتی اور بے حوصلگی کی قوتوں کا مقابلہ کرکے ہمت وحوصلہ اور توانائی کا حصول۔

یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں، جو روحانی نوعیت کی بعض مشقوں سے پیدا ہوسکتی ہیں اور شخصیت کا احاطہ کرسکتی ہیں، ان روحانی مشقوں کا تعلق اللہ کے ذاتی اور صفاتی ناموں کے تکرار سے ہے، جس سے انسانی شخصیت انوار سے سرشار ہوجاتی ہے، معنوی حسن سے بھرپور ہوجاتی ہے، ہمت وحوصلہ اور توانائی کے اعتبار سے کئی گنا زیادہ توانائی کی حامل ہوجاتی ہے، جب یہ تینوں نعمتیں حاصل ہونا شروع ہوجاتی ہیں تو مادی اور نفسی قوتوں کو فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور ان کے اثرات سے بھی چھٹکارہ پانے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، روحانی مشقوں کا یہ سفر مشکل ضرور ہے، لیکن نفس کے دیو کو مفتوح اور فرد کو مہذب بنانے کا بھی مؤثر طریقہ یہی روحانی مشقیں ہیں۔

اللہ کے ذاتی اور صفاتی ناموں کے تکرار سے بندہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، جس کا ذکر ایک حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ میں بندہ کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ کام کرتا ہے، میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے **"فاذکرونی اذکرکم"** (تم مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں)۔

ضمیر کی بیداری کے بغیر

انسانیت کا نئے نئے بحرانوں سے دوچار ہونا

اس وقت پوری انسانیت بڑے بحران کی زد میں ہے، یہ بحران معاشی بھی ہے تو اخلاقی وروحانی اور ضمیر کی مردگی کا بھی، ایک طرف عالمی سرمایہ دار نے انسانوں کے خون پسینے کی محنت کو نچوڑ کر مالدار سے مالدار تر بننے کی روش اختیار کی ہے، اس مقصد کے لئے جمہوریت اور حریت پسندی کا نقاب اوڑھ لیا ہے، دوسری طرف تیسری دنیا کے ممالک میں مقتدر اور مؤثر طبقات نے ملی بھگت کرکے، لوٹ مار کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا ہے کہ دولت پانچ پرسنٹ افراد میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور عام آبادی نانِ شبینہ کی محتاج ہوگئی ہے۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس بحران سے نکلنے کے سارے راستے مسدود ہوگئے ہیں، اس لئے کہ یہ بحران دراصل انسانی حس کی مردگی اور ضمیر کے خاتمہ کا بحران ہے، نیز یہ حرص وہوس کے بے لاگ جذبات کا بحران ہے، جس پر بہتر سے بہتر قانون سازی اور بہتر سے بہتر عدالتی نظام سے بھی قابو نہیں پایا جا سکتا۔

جب تک ضمیر بیدار نہ ہو، فطرت سلیمہ کی حفاظت کا اہتمام نہ ہو، پاکیزہ روحانی صلاحیتوں کی ارتقا کی صورت پیدا نہ ہو، اس وقت تک اس بڑھتے ہوئے ہولناک بحران سے بچا نہیں جا سکتا۔

اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کا ایسا نظام قائم اور رائج ہو، جس کے ذریعہ فرد کی سوئی ہوئی انسانی حس بیدار ہو، انسان کے اندر موجود ملکوتی قوتوں کو نفسی وجود پر غالب کرنے کا اہتمام ہو، یہ سارا کام ایسا ہے، جس کا تعلق باطن کی تبدیلی سے ہے، خارجی زندگی میں حقیقی تبدیلی داخلی تبدیلی ہی سے ہوسکتی ہے، اس کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

تصوف کی مروجہ صورت
اور حقیقی تصوف

مروجہ تصوف، دراصل حقیقی تصوف کی جعلی صورت ہے، مروجہ تصوف میں پیر صاحب عام طور پر ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ نفس پرستی کی قوتوں کو فنا کرکے، اس مقام پر فائز ہونے میں ناکام ہوتا ہے، جہاں دل، دنیا کی محبت، جذبہ شہرت اور بزرگ ہونے کی انانیت کے بتوں سے پاک وصاف ہوجاتا ہے، موجودہ دور میں تصوف نے عام طور پر خاندانی وراثت کی صورت اختیار کر رکھی ہے، حالانکہ حقیقی تصوف کا خاندانی وراثت سے کوئی تعلق نہیں، بزرگی کا سارا تعلق ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے ہے، ان مجاہدوں کے ذریعہ سے اندر میں موجود حب جاہ، حب مال، حرص وہوس اور جذبہ شہرت پر مشتمل پورا بت کدہ ہے، جس کی ٹوٹ کا عمل جاری رہتا ہے، یہ بت خانہ آسانی سے نہیں ٹوٹتا، اس کے لئے طویل عرصے تک ذکر وفکر کے مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، جب یہ بت کدہ ٹوٹتا ہے تب دل کی دنیا آباد اور منور ہوجاتی ہے اور نفس امارہ، نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہوجاتا ہے تو اس کے بعد کہیں جاکر خلافت اور بزرگی کا پروانہ ملتا ہے، اس میں مجاہدوں کے ساتھ ساتھ اللہ کے خاص فضل وکرم کو بھی عمل دخل ہوتا ہے، اللہ کو جس سے دوسروں کی تربیت کا کام لینا ہوتا ہے، اسے اس راہ پر چلا کر نفس کے مکر وفریب کی ہزارہا وارداتوں سے آشنا کرکے، اسے اس مقام پر فائز کرتا ہے۔

تصوف دراصل ہمارے تزکیہ وتربیت کا وہ ادارہ ہے، جو پچھلے چودہ سو سال سے کام کررہا ہے، لاکھوں بزرگان دین نے اپنی زندگیاں مجاہدوں میں صرف کرکے پہلے اپنا تزکیہ کیا، اس کے بعد وہ دوسروں کی تربیت واصلاح کے کام میں مصروف رہے۔ ہماری دعوت واصلاح کی ساری تاریخ انہی بزرگان دین سے وابستہ ہے، ہم اگر اپنی تاریخ سے ان بزرگان دین کو نکال دیں تو ہماری تاریخ روشن مثالوں سے خالی ہوجائے گی، تصوف کے سارے سلسلوں کا باقائدہ شجرہ ہے، اس شجرہ کے مطابق یہ سلسلے حضرت ابا بکرؓ اور حضرت علیؓ کے ذریعہ حضورﷺ تک پہنچتے ہیں۔

انوار کی منتقلی کا یہ سلسلہ ایک تسلسل سے بزرگان دین میں منتقل ہوتا آیا ہے، یعنی تصوف کے سارے سلسلوں کا مرکز حضورﷺ کے نور نبوت کے اجزاء ہیں، ایک ہے علوم نبوت، دوسرا ہے

نور نبوت، علوم نبوت سے ہمیں ساری زندگی کے لئے دین کی ظاہری تعلیمات ملتی ہے، نور نبوت سے باطن کی وسیع دنیا کی اصلاح وپاکیزگی ہوتی ہے، نیز فرد وافراد کے تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کا عمل جاری رہتا ہے، نور نبوت حضورﷺ نے اپنی صحبت کے ذریعہ صحابہ کرام میں منتقل فرمائے، صحابہ کرام نے اپنی صحبت سے تابعین کرام میں یہ انوار منتقل کئے، علوم نبوت اور نور نبوت مل کر ہی ایسا معاشرہ تیار کرتے ہیں، جو اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے ہمہ آہنگ معاشرہ ہوتا ہے جو مادیت پر ٹوٹ پڑنے کی بجائے بنیادی مادی ضروریات کے حصول تک اکتفا کرتا ہے، جو اللہ کی محبت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے۔

حقیقی تصوف سے دوری،

اسباب ونتائج

تصوف کی صحیح حقیقت، اس کی اصل نوعیت نہ سمجھنے اور کچھ جعلی اہل تصوف کی کثرت اور بدعات نے اور کچھ عقلیت کی تیز لہر نے تصوف واہل تصوف کو سخت نقصان پہنچایا ہے، اس کی وجہ سے ہوا یہ ہے کہ ایک تو عاملوں اور جعلی اہل تصوف نے حقیقی بزرگی کی صورت اختیار کی ہے، دوم یہ کہ عقلیت کی جدید تحریکوں کے زیر اثر اہل تصوف سے دوری کی صورت پیدا ہوئی ہے، اس کے نتیجے کے طور پر ایک تو حقیقی اہل تصوف کی خانقاہیں ویرانی کا منظر پیش کررہی ہیں، اس کا دوسرا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہمارا معاشرہ اخلاقی وروحانی طور پر ویرانی کا منظر پیش کررہا ہے، اور حالت یہ ہوگئی ہے کہ لگ بھگ ہر فرد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے جنون میں مبتلا ہوگیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ذہنی، نفسیاتی اور روحانی امراض نے معاشرہ کو جکڑ لیا ہے۔

یہ ساری المناک صورت ہمارے حقیقی خانقاہی نظام کے اجڑ جانے کی وجہ سے ہی پیدا ہوئی ہے، انگریز کی آمد سے پہلے ہمارا معاشرہ روحانی اعتبار سے کافی بہتر حالت میں تھا۔

اس سے دوسو سال پہلے تک حالت یہ تھی کہ اکابر بزرگوں سے اصلاح نفس کے حوالے سے لاکھوں افراد وابستہ تھے، اب صورت یہ ہے کہ عاملوں اور جعلی بزرگوں سے تو رجوع ہے، لیکن نفس کے دیو کو قابو کرنے کے سلسلہ میں حقیقی اہل اللہ سے رجوع نہ ہونے کے برابر ہے، یہ سب سے بڑا المیہ ہے، جو اس دور میں ہوا ہے، موجودہ دور میں فکر کا بحران ہو یا دل کی ویرانی ہو، یہ سب حقیقی خانقاہی نظام سے دوری ہی کا نتیجہ ہے۔

جعلی تصوف کو فروغ دینے کی کاوشیں

عالمی سرمایہ دار اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ مسلمان ممالک بالخصوص پاکستان میں ایسا تصوف فروغ پذیر ہو، جس میں میلے ٹھیلے، راگ رنگ، ناچ، موسیقی اور صوفی شاعروں کے کلام سے دھما چوکڑی کی فضا قائم ہو، اس طرح کے تصوف کو فروغ دینے سے عالمی سرمایہ دار کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی اجتماعی زندگی سے متعلق تعلیمات بالخصوص معاشرتی، عائلی، جہاد اور حمیت دین سے متعلق تعلیمات پر ضرب کاری لگائی جائے، اس طرح لوگوں کو تصوف کے نام سے اسلام کی پاکیزہ دینی اور روحانی تعلیمات سے دور کر دیا جائے، اس مقصد کے لئے عالمی سرمایہ دار جعلی تصوف کو فروغ دینے کے لئے کروڑہا ڈالر خرچ کر رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا تصوف یا ہماری روحانیت یا ہمارا مراقبہ، اسلامی تعلیمات اور افراد کے اسلامی مزاج کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے، ہمارے تصوف اور مراقبہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ فرد وافراد جوں جوں مراقبہ میں آگے بڑھتے جائیں گے، اسی مناسبت سے اسلامی حمیت بیدار ہوتی جائے گی اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا ہوتی جائے گی، توحید میں رسوخ پیدا ہوتا جائے گا۔

تصوف یا مراقبہ کا ایسا تصور جس سے باطنی جذبات واحساسات میں پاکیزگی پیدا نہ ہو، اسلامی تعلیمات سے گہری وابستگی پیدا نہ ہو، یہ جعلی تصوف اور روحانیت کا جعلی تصور تو ہوسکتا ہے، حقیقی تصوف اور حقیقی روحانیت نہیں، اسلامی تعلیمات اور تصوف ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں، ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مذاہب کی وحدت کی موجودہ کوششوں کا ہدف اسلام کو نشانہ بنانا ہے اور اس مقصد کے لئے تصوف کو استعمال کرنے کی کاوشیں ہورہی ہیں، صوفی یونیورسٹی کا قیام یا صوفیانہ راگ ورنگ کی بڑے پیمانہ پر محفلوں کا اہتمام یہ سب انہی کوششوں کا حصہ ہے۔

اہل سیاست کو ایک دوسرے
کے لئے جذبات احترام کی ضرورت

ہماری سیاست، صحافت اور الیکٹرانک میڈیا نے جو صورت اختیار کی ہے،وہ بڑی تشویشناک ہے، یہ ادارے تو ایسے ہیں جو کسی بھی قوم وملت کی صحیح ذہن سازی اور تربیت کا ذریعہ ہوتے ہیں، جب کہ ہمارے یہ ادارے ایک دوسرے سے نفرت، کدورت، دوری ودشمنی پیدا کرنے، ایک دوسری کی کردارکشی،قوم کی صحیح بنیادوں پرتعمیر کی بجائے حالات، مسائل ومعاملات کے منفی پہلو کی پیشکش کا موجب ہیں۔

ہماری سیاست طویل عرصہ تک دولت کمانے، اقتدار پر زیادہ سے زیادہ عرصہ تک فائز رہنے اور منصب کے حصول کا ذریعہ رہی ہے، اس لئے اقتدار سے محروم اہل سیاست کی ساری کاوشیں حکمرانوں کو ان کے عہدوں سے معذول کرکے،خود حکمرانی پر فائز رہنے کے مرکز کے گرد گھومتی ہیں، ہماری صحافت اور میڈیا سیاستدانوں کی باہمی لڑائی کو مرچ مصالحہ لگا کر پیش کرتی ہے، جس سے جہاں قومی اتحاد مجروح ہوکر، انتشار کی صورت پیدا ہوتی ہے، وہاں قوم کی منفی بنیادوں پر ذہنی تربیت ہوتی ہے اور سیاسی گروہ بندی مستحکم سے مستحکم تر ہوتی ہے۔

ہمارے اہل سیاست کو وسعتِ نظری کا ثبوت دینا چاہئے اور دولت اور منصب کے حصول کی خاطر سیاست کو ایک دوسرے سے تصادم کا ذریعہ بنانے کی بجائے سیاست کے صحتمندانہ آداب کا سلیقہ سیکھنا چاہئے، اگر اہل سیاست اور حکمران ہی ایک دوسرے سے متصادم ہوں گے اور اس تصادم کو وظیفہ بنائیں گے تو قومی تعمیر کے منصوبے کیسے شرمندہ تعبیر ہوں گے، اس مقصد کے لئے زبان کو قابو کرنے کا طریقہ سیکھنا ہوگا، اپنے جذبات کے مظاہرہ کے لئے احتیاط سے کام لینا ہوگا، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دل میں ایک دوسرے کے لئے احترام کے جذبات موجود ہوں، ورنہ قوم کے اجتماعی شیرازے کے بکھرنے کا جوعمل جاری ہے، اس میں تیزی آتی جائے گی اور اجتماعی زندگی کی بہتری کی صورتیں مسدود ہوتی جائیں گی، اس طرح ہماری سیاست قوم کے لئے بڑا المیہ بن جائے گی۔

دولت کا جنون،
سکون قلبی کی بربادی کا ذریعہ

ہمارے حکمرانوں، سرمائیداروں، بیوروکریٹس اور بڑے بڑے ڈاکٹروں اور نامور وکیلوں نے دولت کے انبار جمع کر لئے ہیں، اگر وہ اس دولت کے ایک حصہ ہی کی قربانی دیں تو ریاست پاکستان بیرونی قرضوں سے آسانی سے نجات حاصل کرسکتی ہے اور عام لوگوں کی معاشی حالات میں بہتری آسکتی ہے، لیکن بُرا ہو دولت کی محبت اور حرص وہوس کے بتوں کا کہ دولت جمع کرنے کا ایک جنون ہے، جو سارے مؤثر طبقات میں پیدا ہوگیا ہے، ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔

دولت کا مقصد تو ذہنی سکون اور قلبی سکون کا حصول ہوتا ہے،لیکن اگر ذہنی اور قلبی سکون ہی برباد ہوجائے اور اس دولت کو محفوظ رکھنے کی فکر اور دولت سے مزید دولت بنانے کا جنون غالب ہوجائے تو ایسی دولت کا کیا فائدہ؟ بلکہ حقیقت شناس فرد کی تو حالت یہ ہونی چاہئے کہ سکون کی بربادی کی قیمت پر اگر اسے دولت کے انبار مفت میں حاصل ہوجائیں تو اسے قبول کرنے سے انکار کرنا چاہئے۔

قلبی سکون اور دولت کے انبار ایک دوسرے کے متضاد ہیں، کثرت دولت جہاں بھی آئے گی، وہاں سکون برباد ہوگا، ویسے بھی انسان کی بنیادی ضروریات محدود ہیں، دو وقت کی روٹی، دوچار جوڑے کپڑے، سادہ مکان اور سادہ سواری،قلبی سکون کی دولت ایسی عظیم نعمت ہے کہ ساری دنیا کے خزانے خرچ کرکے بھی سکون کی یہ نعمت عظمیٰ حاصل نہیں ہوسکتی، کیا آپ قلبی سکون اور ذہنی سکون کی نعمت چاہتے ہیں، اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ کو اللہ کے ذاتی اور صفاتی ناموں کے تکرار سے دل کی ویران دنیا کو منور، شاداب اور آباد کرنا چاہئے۔ اس سے آپ کو دنیا پر ٹوٹ پڑنے کی نفسیات سے نجات ملے گی اور آپ اس دنیا میں ہی روحانی اور وجدانی طور پر جنت کے منظر سے محظوظ ہوں گے۔

ذہنی اور نفسیاتی بالیدگی کی صورتیں

ہر دور میں ہر فرد کو جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت رہی ہے، جس سے فرد کی بہتر طور پر ذہنی اور نفسیاتی بالیدگی کی صورت پیدا ہوتی ہے، ان میں صبر وشکر کی نفسیات ہے، تھوڑے پر راضی رہنے کا مزاج ہے اور اللہ کی نعمتوں پر شکر ادائیگی کے احساسات ہیں، دنیا پر حریص ہو کر اس پر ٹوٹ پڑنے سے انکار کی روش ہے، سادگی کے ساتھ زندگی گذارنے کا سلیقہ ہے، اپنی دولت میں محروم افراد کا حصہ رکھنے کا احساس ہے، معیشت، معاشرت، انتظامیہ وسیاست میں بہتر اور پاکیزہ کردار کا مظاہرہ ہے۔

یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جس سے روحانی تسکین، قلبی سکون اور ذہنی اطمینان حاصل ہوتا ہے، حرص وہوس کے بتوں سے نجات ملتی ہے، فطرت سے ہمہ آہنگی پیدا ہوتی ہے۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہی خصوصیات اور نعمتیں ایسی ہیں، جس سے ہم محروم ہیں، ہمارے آباؤ اجداد ایک حد تک ان خصوصیات سے بہرہ ور تھے، اس لئے وہ مالی کشادگی نہ ہونے کے باوجود خوشی وراحت کی زندگی گزارنے میں کامیاب ہوئے، جب کہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دنیاوی مستقبل کی فکرمندی کیلئے لرزاں وترساں ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہم اہل اللہ جو ان خصوصیات سے بہرہ ور ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے اپنے اندر یہ خصوصیات پیدا کریں۔

زندگی میں موجود زبردست خلا کو سمجھنے اور اسے پُر کرنے کی ضرورت

آپ اگر غور کریں گے تو محسوس کریں گے کہ آپ کی زندگی میں زبردست خلا موجود ہے، زندگی میں یہ خلا ایسا ہے، جس کے ہوتے ہوئے آپ مثبت اور صحتمند سوچ کے حامل نہیں ہو سکتے اور آپ تعمیر کا کوئی بھی کام صحیح خطوط پر نہیں کر سکتے، زندگی میں موجود اس خلا کی علامتیں یہ ہیں اپنی اصلاح کی فکر کی بجائے دوسروں کی خامیاں تلاش کرتے رہنا اور ان پر تنقیدی نگاہ کا ہونا، تھوڑی تھوڑی بات پر ناراض رہنے کی نفسیات کا غالب ہونا، اختلاف کے وقت سلیقہ اور سنجیدگی کے فقدان کا ہونا، دوسروں سے مفادات وابستہ کرنا، دوسروں سے اپنی تعریف کی امید رکھنا، تعریف نہ ہونے پر ناراض ہونا، معیار زندگی کو بلند سے بلند کرنے کی آرزوؤں کا ہونا، انانیت کے مظاہرہ کا ہونا، خودپسندی اور خودرائی کی نفسیات کا حامل ہونا، اپنے سے زیادہ تجربات کے حامل افراد کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کا نہ ہونا، بزرگوں کے ادب وآداب وتکریم کی استعداد کا نہ ہونا، دولت کو عزت کا معیار قرار دینا، اپنی اولاد کی شادیوں کے مواقع پر لاکھوں روپے اڑا دینا، اس طرح دوسروں کے لئے غلط مثالیں قائم کرنا وغیرہ وغیرہ۔

زندگی میں یہ خلا ایسا ہے، جسے سمجھنے اور اسے پُر کرنے کی ضرورت ہے، یہ خلا دراصل روح کے طاقتور نہ ہونے کا خلا ہے، روح جو انسان کی اصل شخصیت ہے، وہ خلا میں نہیں رہ سکتی، اسے محبوب حقیقی کے انوار حسن کی خوراک چاہئے، اسے یہ خوراک ذکروفکر کی روحانی مشقوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے، اس سے روح طاقتور ہونے لگتی ہے اور طاقتور روح سے پاکیزہ کردار کی نمود ہوتی ہے، ہماری زندگی میں موجود سارے خلا اسی سے پُر ہو سکتے ہیں۔

قومی تعمیر نو کے کاموں کے لئے

روحانی قوت کی ضرورت

تعمیر معاشرے کے بہت سارے کام ہیں جو ہماری توجہ کے محتاج ہیں اور جو ہمیں کرنے ہیں، مثلاً صحیح خطوط پر ذہن سازی کا کام ہے، یا محلّہ کی بنیاد پر محلّہ کے حساس افراد کو جمع کر کے، ان کے تعاون سے محلّہ کے محتاج، بے بس اور غریب افراد کی مالی معاونت کا کام ہے، یا غلط الزامات میں جو ہزاروں افراد جیلوں میں قید ہیں، ان کی اور ان کے پسماندگان کی مدد کا کام ہے، غریب افراد کے بچوں کی تعلیم کا کام ہے کہ اسکولوں کی فیس کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے وہ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں، اس طرح کے قومی تعمیر نو کے بہت سارے کام ہیں، جو ہمیں کرنے چاہئے، لیکن احساس ہونے کے باوجود یہ کام اگر نہیں ہوتے یا ہم ان کاموں کو سرانجام دینے کی ہمت وحوصلہ سے محروم ہیں تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم میں روحانی صلاحیت اور روحانی طاقت موجود نہیں ہے، فرد میں ہمت وحوصلہ اور تعمیر نو کے کرنے کا جذبہ روحانی طاقت ہی سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ محض علم اور معمولی نوعیت کے احساس سے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قومی تعمیر نو کے کاموں سے پہلے سب سے زیادہ اپنی شخصیت کی پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر اور نشوونما کا کام ہے، جب روح قوی ہوجاتی ہے تو وہ شخصیت کو سماجی اور اجتماعی بہتری کے کاموں کے لئے اکسانے پر آمادہ کرتی ہے، روح کے قوی ہونے سے اس طرح کے کاموں کے لئے اخلاص، للھیت اور بے نفسی بھی آجاتی ہے تو بہتر سے بہتر اور نئی سے نئی تدابیر بھی سامنے آتی ہیں، ساتھ ساتھ اللہ کی مدد ونصرت بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ روحانی طاقت کیسے پیدا ہو؟ روحانی طاقت کے لئے خودشناسی وخدا شناسی کی ضرورت ہے، جو اللہ کے ذاتی اور صفاتی ناموں کے تکرار اور روحانی نوعیت کی مشقوں سے پیدا ہوگی، ہمیں سب سے پہلے اس کام کو اہمیت دینا ہوگی، دوسری صورت میں ہم قومی تعمیر کے نام سے باتوں اور گفتگو برائے گفتگو سے آگے نہ بڑھ سکیں گے۔

انسانیت کا باطنی بیماریوں میں جکڑ جانا

اس وقت انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ باطنی نوعیت کی بُرائیاں ہیں، جس میں ہم سمیت پوری انسانیت جکڑ چکی ہے، قوموں اور معاشروں میں موجود فساد کا اصل سبب یہی باطنی نوعیت کی بیماریاں ہیں، ان بیماریوں میں حاسدانہ جذبات وحاسدانہ کارروائیاں بھی شامل ہیں تو تکبر، انانیت، بڑے پن اور فوقیت کے احساسات وجذبات بھی، ان بیماریوں میں دنیا سے فریفتگی کی حد تک محبت کے میلانات ورجحانات بھی شامل ہیں تو شہرت، خودنمائی اور ریا کے جذبات بھی۔

ہر انسان کی آزمائش کی خاطر اس کے نفس کی ساخت میں بُرائیوں کے یہ طاقتور جذبات رکھ دیئے گئے ہیں، آزمائش یہ ہے کہ فرد ان جذبات کو پامال کر کے نفس کو مہذب اور پاکیزہ بنانے میں کامیاب رہتا ہے یا ناکام۔

انسان کے ان جذبات کی حیثیت سمندر کی گہرائیوں کی سی ہے جس میں بہت ساری مخلوق رہتی ہے، جس میں مگرمچھ بھی شامل ہیں یا وسیع تر جنگل کی سی ہے، جس میں ہر طرح کے درندے رہتے ہیں، نفس کی وسیع دنیا میں بھی خونخوار درندے رہتے ہیں، جو اپنے جیسے انسانوں کے لئے سم قاتل ہیں، اس وقت سرمایہ دار ہو یا مالدار یا بڑے بڑے منصب پر فائز افراد، وہ مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح تک اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ جو سلوک اختیار کررہے ہیں، دولت جمع کرنے کی خاطر ان کی جیبوں پر جس طرح ڈاکہ ڈال رہے ہیں، یا بھوک کی وجہ سے لوگوں کو خودکشی کرنے پر مجبور کررہے ہیں، یہ اس بات کی واضح شہادت ہے کہ حب مال اور حب جاہ جیسی بیماریاں انسانیت کے لئے سم قاتل ہیں۔

ضرورت ہے کہ ان بیماریوں سے نجات حاصل کرنے اور نفس کی وسیع دنیا کے اندر موجود درندوں سے نفس کے جنگل کو صاف کر کے، نفس کو نفس مطمئنہ بنانے کے کام کو سارے کاموں پر ترجیح دی جائے، اسی سے انسانیت کی فلاح اور نجات وابستہ ہے۔

قومی تعمیر کے کام کا

نفس کو مہذب بنانے سے وابستہ ہونا

قومی تعمیر کے سارے کاموں کا تعلق نفس کو پاکیزہ اور مہذب بنانے سے ہے، اس کے بغیر قومی تعمیر کے کاموں میں خیر وبرکت ہو، ملت کی حقیقی تعمیر کا کام ہو، افرادِ قوم کو سکون کی نعمت عظمیٰ حاصل ہو، افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات میں محبت اور خوشگواری کا عنصر شامل ہو، اہل سیاست، اہل تجارت اور قومی زندگی کے سارے طبقات میں خیر سگالی کی فضا موجود ہو، ممکن نہیں۔

نفس کو مہذب بنانے کے کام کی اتنی فیصلہ کن اہمیت کے باوجود یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہمارا پورا نظام تعلیم تزکیہ نفس اور نفس کے اندر موجود قوتوں پر نہ تو بحث کرتا ہے اور نہ ہی نفس کے سدھارنے اور اس کی اصلاح کے سلسلہ میں کوئی کردار ادا کرتا ہے، ہماری سیاست کا بھی یہی حال ہے، جو سیاست قوم پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ خود نفسیانیت اور اناؤں کے ٹکراؤ سے دوچار ہیں، ہماری صحافت اور الیکٹرانک میڈیا تو نفسی قوتوں کو طاقتور بنانے کا کردار ادا کرتی ہے۔

ان حالات میں قوم کی اصلاح ہو تو کیسے ہو، معاشرے میں موجود بڑھتے ہوئے فساد کی روک تھام ہو تو کیسے ہو؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاست، صحافت اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ افراد اپنی روش پر نذر ثانی کریں اور قوم وملت کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے سیاست، صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کو قومی تعمیر کے حقیقی مقصد کے لئے استعمال کریں، یہ کام ایسا ہے جو ان کی منصبی ذمہ داری سے تعلق رکھتا ہے۔

بیداری ملت کے سلسلہ میں

اہل تصوف کا کردار

بیداریٔ ملت کے سلسلے میں تصوف واہل تصوف شروع سے اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں، ہماری تاریخ میں سیاست کا رخ تو بدلتا رہا ہے، وقت کے بادشاہ اکثر حکمرانی کے نشہ میں چور رہے ہیں، لیکن ہماری پوری تاریخ میں اہل تصوف چٹائی پر بیٹھکر لوگوں کی تربیت، تزکیہ اور اصلاح کا کام کرتے رہے ہیں، اس طرح وہ معاشرے کو اخلاقی اور روحانی طور پر سنبھالتے رہے ہیں، چنانچہ مسلم معاشرہ کبھی بھی بہت بڑے بگاڑ سے دوچار نہیں ہوا۔ اس کا سبب حکمرانوں کا کردار یا ان کی پالیسیاں نہیں تھی، بلکہ اس کا سبب ان بوریہ نشینوں کا پاکیزہ کردار، ان کی خدمت انسانیت اور لوگوں کے نفس کی اصلاح میں توانائیاں صرف کرنا تھی۔

ہمارے معاشرے کے بگاڑ میں تیزی فرنگی اقوام کے غلبہ سے شروع ہوتی ہے کہ انہوں نے ہمارے نظام تعلیم اور ہمارے نظام قانون وغیرہ کو بدل کر انہیں اپنے نظریات سے ہمہ آہنگ کیا، جس سے عقل وعقلیت کے فتنہ نے جنم لیا اور معاشرے میں سرے سے اہل اللہ کے تزکیہ وتربیت اور اصلاح کے سلسلے میں ان کے کردار سے انکار کیا گیا اور یہ روش غالب ہوئی، پھر جدید نظریات اور مادی تہذیب کے غلبہ نے یہ حالت پیدا کردی کہ سرے سے فکر ونظر میں ہی تبدیلی پیدا ہوئی، پہلے یہ حالت تھی کہ معاشرے کے لاکھوں افراد اصلاح نفس کے سلسلے میں اہل اللہ سے رجوع ہوتے تھے، جس سے معاشرہ اخلاقی اور روحانی طور پر مستحکم ہوتا تھا، اب یہ حالت ہوگئی کہ بالخصوص سارے جدید طبقات خودسری کا شکار ہوکر، اہل اللہ سے بے نیاز ہوگئے، جس سے معاشرے میں دنیا کی دوڑ شروع ہوگئی اور عزت کا معیار دولت قرار پائی۔

مسلم معاشرے کی یہ تبدیلی اتنی بڑی تبدیلی ہے کہ دھائی تین سو سال پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اب جہاں فکری طور پر سیکولر نظریات کا غلبہ ہوا وہاں عملی طور پر اخلاقی اور روحانی بحران بھی پیدا ہوا اور معاشرہ میں نفسیاتی بیماریوں کی وبا پھوٹ پڑی۔

ان حالات میں اہل اللہ کردار ادا کریں تو کیسے کریں، اس لئے کہ جب افراد معاشرہ اصلاح اور تزکیہ کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں اور وہ اہل اللہ کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہی تیار نہ ہوں تو معاشرہ کے سدھارے کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں۔

حقیقی اہل اللہ کی صحبت کے فوائد و ثمرات، ایک نظر میں

اہل اللہ کی صحبت کے جو فوائد اور ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ذکر میں ذوق وشوق کا ہونا (۲) ٹوٹا ہوا دل ہونا یعنی شکستہ دل کی حالت کا ہونا (۳) دنیا سے دل کا سرد ہو جانا (۴) اپنے کچھ بھی نہ ہونے کے احساس کا غالب ہونا (۵) دنیا کی ڈور میں شریک ہونے سے انکار کی نفسیات کا ہونا (۶) علم، وقت اور مال میں برکت کا ہونا (۷) وقت کے ایک ایک لمحہ کے صحیح استعمال کے احساس کا غالب ہونا (۸) نرمی اور محبت کے اوصاف کا ہونا (۹) ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر کا ہونا (۱۰) مزاج کے خلاف باتوں کو برداشت کرنے کے حوصلہ کا ہونا (۱۱) اللہ سے مانگنے کی نفسیات کا غالب ہونا (۱۲) عاجزی، فنائیت اور نفیٔ ذات کے احساس کا ہونا (۱۳) اللہ کے جلالی وجمالی صفات کے عکس کی حالت میں رہنے کی وجہ سے اللہ سے اپنے فضل خاص کی بھیک مانگتے رہنا (۱۴) آخرت کے دھیان کا غالب ہونا (۱۵) دنیا میں زیادہ مصروفیت یا زیادہ گفتگو کی وجہ سے کیفیات کا سلب ہونا (۱۶) قلبی سکون کی حالت کا ہونا (۱۷) خود احتسابی کی حالت میں رہنا (۱۸) دل کے مفتی کا بیدار اور طاقتور ہونا (۱۹) اسلامی شریعت کے منافی حرکت سے دل کے نظام کا درہم برہم ہونا (۲۰) نفسی قوتوں کو مطیع اور مفتوح کرنے کے سلسلے میں رفتہ رفتہ پیش قدمی کا ہونا (۲۱) دل اور روح کی خصوصیات اور ان کی نزاکتوں کے فہم کا ہونا (۲۲) محبوب حقیقی کی راہ پر مسلسل آگے بڑھتے رہنا (۲۳) باطن کی وسیع دنیا کا سیر وسفر کرنا (۲۴) سیرت وکردار میں بتدریج بہتری کا ہونا (۲۵) ناسازگار حالت کے وقت اللہ سے خوب مانگتے رہنا (۲۶) اللہ کی جلالی صفات کو برداشت کرنے کے حوصلہ کا ہونا (۲۷) پرانی فاسد عادات کی جگہ نئی بہتر عادتوں کا پیدا ہونا (۲۸) سب کی بھلائی اور خیر خواہی چاہنا (۲۹) مسلمانوں کی حالت زار پر کڑھتے رہنا اور فکر مند رہنا (۳۰) اپنی شخصیت کی چاہت سے دستبردار ہونا (۳۱) نفسی قوتوں کی شہ زوری کا شکوہ اللہ محبوب سے کرنا (۳۲) محبوب کے فراق کے غم اور وصال کے لئے مجاہدوں سے مسلسل کام لیتے رہنا اور تھکنے کا نام نہ لینا (۳۳) دوسرے سارے افکار پر محبوب کی رضا جوئی کی فکر کا غالب ہونا (۳۴) زمانہ کے تھپیروں سے زیر وزبر نہ ہونا (۳۵) ابتلا وآمائش کے بے شمار مراحل سے گزار کر طالب کا نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایسے اوصاف ہیں، جس میں عبدیت اور سلیقہ انسانیت کی ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ افراد جنہیں مادیت اور نفس پرستی کے حالات میں حقیقی اہل اللہ نصیب ہو جائے اور ان کی صحبت حاصل ہو جائے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

تجدد کے نام پر مغرب کی تقلید کی دعوت

محققین اور اصحاب فکر ونظر کا خیال ہے کہ کسی حقیقت کے بارے میں تسلیم ویقین کے بجائے شک وشبہ مزید علم وتحقیق کا ذریعہ ہے اور اس تلاش وجستجو سے نئے گوشے کھلتے اور نئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں، کیونکہ علم کوئی جامد چیز نہیں ہے جو ہمیشہ یکساں اور ایک حالت پر رہے، بلکہ انسان کی فہم اور اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے، اس کی طبیعت ترقی پذیر ہے، اس میں ہر نئی تحقیق ونظریہ اور فکر سے نئی بات اور نیا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، ایک ہی موضوع پر مختلف انداز اور مختلف زاویہ سے غور کرنے والے الگ الگ نتائج اخذ کرتے ہیں اور مختلف شکلوں میں اس کو پیش کرتے ہیں، اسی لیے رجحانات اور نظریات کے اعتبار سے اختلاف رائے بھی ہوتا ہے، ایک مفکر اور صاحب نظر دوسرے کی فکر ورائے کو بے کم وکاست قبول نہیں کر لیتا، ایک تحریک کا بانی دوسرے قائد اور بانی کے وضع کردہ اصول وتحریک پر کلمہ توحید کی طرح ایمان نہیں لے آتا، اور حقیقت یہ ہے کہ علمی میدان میں اور آج کے سائنسی دور میں نئے نئے انکشافات اور نئی دریافتیں اسی شک وشبہ اور عدم قبول کی دین ہیں، اہل مغرب، سائنس اور تحقیقات کے تقدس پر ایمان نہیں لاتے اور نہ وہ کسی نظریہ کو محض ایک نظریہ ہونے کی وجہ سے بغیر تحقیق کے قبول کرتے ہیں، بلکہ تقلید اور اتباع محض کی سب سے زیادہ انہوں نے مخالفت کی، اور مشرق والوں کے ذہن میں یہ اصول راسخ کر دیا جس پر مشرق کے مغرب زدہ علماء عمل پیرا ہیں، لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ مشرقی سادہ لوح انہی اہل مغرب کی تقلید اور ان کی تحقیقات کے سامنے عقیدتمندی کے اظہار پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مغرب کی کورانہ تقلید

مشرقی قوموں کے نزدیک اہل مغرب کی تحقیقات، بدیہیات سے کسی طرح کم نہیں، چنانچہ عقل ونقل کے درمیان تعارض کے وقت نقل وروایت کو ہفوات وخرافات سمجھ کر نظر انداز کر دیا

جاتا ہے کیونکہ عقل اور سائنس ہی ان کے نزدیک معیار حکمت اور صحیح وصواب کا تھرمامیٹر ہے، لیکن اگر یہی نقل مغربی روایات سے ماخوذ ہو تو ہر طرح قابل ترجیح اور لائق عمل ہو جاتا ہے۔ آج مغربی علوم سیکھنے والے مسلم دانشور اور تہذیب نو کے پروردہ لوگ تہذیب وثقافت میں، علم و تحقیق میں اور سائنسی تجربات میں مغرب کے تقدس مآبی پر ایمان لا چکے ہیں، ان کے نزدیک اہل مغرب سے کسی چیز میں غلطی کیا لغزش اور چوک بھی امکانیات سے بالاتر ہے، خواہ وہ نظریات، مشرقی نظریات، مشرقی قدروں، زندگی کے مشرقی اصول مشرقی طرز فکر اور مشرق کی جغرافیائی خصوصیات سے کتنے ہی مختلف اور متصادم کیوں نہ ہوں اور اہل مشرق کی دینی حمیت وغیرت اور قومی تشخص کے لیے مضر اور مہلک کیوں نہ ہوں، لیکن وہ مغرب کی وفاداری میں ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہیں اور اپنے تمام تشخصات وامتیازات اور قومی وجود سے بہ رضا ورغبت دستبردار ہونے پر آمادہ ہیں، چنانچہ مشرقی انسان اور خصوصا مسلمان جو سیاست وثقافت اور نظریات کے حملوں کا براہ راست نشانہ ہے وہ اہل مغرب کے سامنے ایک سعادتمند شاگرد بن چکا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے استاد مغرب کے نشان قدم پر چلتا ہے، یہ مشرقی انسان اپنے ذاتی جذبات، احساسات وکیفیات اور فکری آزادی سے یکسر محروم ہو چکا ہے کیونکہ وہ اپنے استاد کے کمالات پر یقین کر کے اس کو لغزشوں اور غلطیوں سے ماوراء سمجھنے لگا ہے، وہ پوری طرح مغرب کا ہو چکا ہے، اس کا جسم مشرقی ہے لیکن روح وفکر مغربی ہے، مغرب سے آنے والے علوم وافکار کی عظمت اور ان کے ساتھ عقیدت ونیاز مندی کا یہ مزاج عالم اسلام کے دور انحطاط میں سامراجی سائے میں پیدا ہوا۔ سامراجی حکومت میں قائم ہونے والی تعلیم گاہوں اور تربیتی اداروں نے مغربی سیلاب میں آنے والے ہر خس وخاشاک کو لائق صد احترام بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور ذہنوں پر مغربی برتری کا ایسا گہرا اثر ڈالا جو حالات بدلنے کے بعد بھی ذہنوں سے نہیں نکل سکا۔

ذھنی غلامی اب وہ دور گذر چکا، مشرقی قومیں اور خصوصا مسلمان مغربی غلامی سے آزاد ہو گئے ان کی اپنی حکومتیں قائم ہو گئیں جن کی باگ ڈور مشرقی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، ان کے مدارس اور یونیورسٹیاں اور ان کی علمی وتحقیقی اکیڈمیاں قائم ہیں، لیکن مسلمانوں کی اس ترقی کے بعد آج بھی

ان کے اداروں میں، افراد میں جس جوہر اور جس متاع گرانمایہ کی کمی ہے، وہ ہے آزادی فکر، خود اعتمادی، اجتہاد اور اختراع، وہ آج مغرب سے آزاد ہو کر بھی ذہنی غلامی کے شکار ہیں۔ وہ یورپین عینک سے دیکھتے اور اسی کسوٹی پر پرکھتے اور اسی دماغ سے سوچتے ہیں، اصلاح وتربیت کے ذمہ دار معلمین واساتذہ جنہیں نئی نسل کے اندر بلند حوصلگی کی جان ڈالنی چاہئے، قوم کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرنا چاہئے اور ترقی کے لیے نئی راہ بنانے کے لیے تیار کرنا چاہیے، وہ نونہالان قوم کو مغرب کے ساتھ صرف شمولیت اور شریک رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

مغرب سے مرعوبیت

چنانچہ مشرقی انسان نے ترقی کی راہ میں پچھلی صفوں میں رہنا پسند کیا، اور اس دوڑ اور ریس کے زمانہ میں اپنے لیے آخری صفوں کا انتخاب کیا، ہمارا تعلیمی نظام ہو یا سیاسی نظام یا اقتصادی یہاں تک کہ سماجی اور عائلی نظام بھی مغرب کی پیروی اور نقالی کی بنیاد پر قائم ہے اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارا ادب اور تنقیدی قدریں بھی بڑی حد تک مغربی تعلیم کے نتیجہ میں تقلید مغرب کا شکار ہو گئی ہیں، جس کی ہمت وحوصلہ کی انتہائی پرواز تماشائی بننا یا زیادہ سے زیادہ شریک کار رہنا ہو وہ مقابلہ اور پیش قدمی کو کیونکر سوچ سکتا ہے؟ وہ تقلید واتباع اور ذہنی غلامی کی بنا پر فکر وعمل کی آزادی، ایجاد واختراع اور انکشاف ودریافت کے میدان میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے خیال میں قافلہ سالار ہونا اور قائد ورہنما بننا اس کے عبقری استاد مغرب کے سواد وسرے کو زیب نہیں دیتا، ہمارے عصری تعلیم یافتہ طبقے پر اس کورانہ تقلید نے ایسا جادو کیا ہے کہ وہ مشرقی کے کارناموں اور فضل وکمال کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے، ارسطو اور دیگر یونانی فلاسفہ کا ذکر صرف اس بنا پر کرتے ہیں کہ یہ یونانی فلاسفہ، مغرب کے استاد اول ہیں، ورنہ ان کو تو مسلم فلاسفہ کے ذکر سے شرم آتی ہے جو یونانی فلسفہ کے نہ صرف ماہر بلکہ فلسفہ ومنطق میں اعلیٰ مقام اور انفرادیت کے حامل تھے، امام غزالی جیسا عبقری جس نے فلسفہ یونان کی تردید اور جوابات سے اس کی عظیم الشان عمارت کو متزلزل کر دیا، اور امام رازی جنہوں نے فلسفہ کا طلسم توڑ کر رکھ دیا اور مولانا جلال الدین رومی، ابن خلدون اور دیگر علماء مصلحین کی طرف انتساب کو یہ لوگ اپنے لیے عار سمجھتے ہیں، اور اس کو قدامت پسندی سے تعبیر

کرتے ہیں، لیکن حیرت ہے کہ ان حکمائے اسلام سے صدیوں قبل پہلے سے یونانی فلاسفہ، ارسطو، جالینوس وغیرہ کی طرف نسبت کو یہ ترقی اور تجدد کی علامت قرار دیتے ہیں۔

اور سب سے زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تحقیق وریسرچ کرنے والے مسلمان، اسلامیات کے سلسلے میں مستشرقین پر اعتماد کرتے ہیں اور اسلامی علوم وفنون میں مستشرقین کی تشریحات اور تصنیفات ان کے لیے مرجع اور مآخذ ہوتی ہیں اور وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ کہاں کہاں ان مستشرقین نے غلط بیانی سے کام لیا، اور کہاں کہاں اپنے قاری کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، اور کس طرح بے بنیاد باتوں کا سہارا لے کر ایک مضبوط اور پختہ بنیاد پر قائم اسلامی پرشکوہ عمارت کو ڈھانے کی کوشش کی۔

صلیبی روح اور عناد

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے مرکز بغداد واندلس کے زمانۂ عروج میں یورپ اپنے انتہائی تاریک دور سے گذر رہا تھا اس وقت وہاں کلیسائی ظلم عام تھا اور علمی خزانے کئی تالوں میں بند تھے، مسلمانوں کے علمی مزاج، آزادئ فکر اور فراخ دلی نے ان علوم کو عام کیا، اور بغداد واندلس کے عہد انحطاط سے یورپ میں بیداری پیدا ہوئی، یورپ نے مسلمانوں سے تہذیب وثقافت لی اور حکمائے اسلام ابن سینا وفارابی سے فلسفہ ومنطق سیکھا، لیکن یورپ اپنے عناد، قومی غرور اور اسلام دشمنی کی بنا پر مسلمانوں کا منت کش نہ ہوا، مغرب کے دل میں اس کی بیداری کے روزِ اول سے ہی صلیبی جنگوں کی وجہ سے اسلام دشمنی کے شرارے روشن تھے، یورپ نے مسلمانوں سے علوم حاصل کرنے کے وقت بھی خود کو مسلمانوں کا ممنون کرم نہیں سمجھا اور نہ تقلید واتباع کے لیے تیار ہوا، یورپ کا دل مسلمانوں کی طرف سے کبھی صاف نہیں رہا، اس کی دماغی صلاحیت مسلمانوں کے خلاف مصروف کار رہی، تمدن وتہذیب، حکومت وسیاست اور علم وفن کی گرم بازاری میں بھی مسلمانوں سے مقابلہ اور آزادی کے جذبات نے ان کے اندر روح کو سرگرم عمل رکھا، اور وہ تدریجا آگے بڑھتے رہے، بالآخر اپنی علمی مہارت وکمال کے ذریعہ بولتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانی طبیعت کے مطابق نئے نئے نظریات اور تصورات قائم کیے اور انہی نظریات وفلسفات کے ذریعہ مسلمانوں پر

حملہ آور ہوئے اور انہوں نے اپنا تشخص نظر انداز نہ کیا اور نہ اپنی مذہبی انفرادیت، بلکہ عصبیت اس علمی وثقافتی استفادہ کے باوجود کم نہ ہونے دی جو مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات سے ظاہر ہے۔

نقل وتقلید کا طوق

اس طرح مغرب، بہت کم وقت میں شاگردی کے دور سے گذر کر استادی کے مرحلہ میں داخل ہو گیا، اور آج کے مسلمان جنہوں نے عصری علوم حاصل کیے، مغربی دانشوروں کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا اور اسلامی ملکوں میں کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں، علمی وفکری میدان میں روز افزوں ترقی کرتے رہے، لیکن ان مراحل سے گذر کر ترقی کے اس طویل ترین عبوری دور کے بعد آج تک وہ مغرب سے علیحدہ نہ ہو سکے، وہ نقل وتقلید کا طوق ڈالے رہے، اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے اور ابتکار واختراع کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر سکے، تہذیب وثقافت علم وفن، تحقیقات ونظریات اور تمدن وسیاست ہر میدان میں خود کفیل ہونے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی قوم تا آنکہ وہ تقلید کا طوق نہ اتار پھینکے فکر ونظر کا دروازہ اس کے لیے کھل نہیں سکتا، فکری ونظری سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور وہ قوم فکری طور پر بانجھ ہو جاتی ہے، عصر حاضر کے مسلمانوں کے مغرب سے بچھڑ جانے کی سب سے بڑی وجہ ان صلاحیتوں کے بارے میں اپنے اندر منفی پہلو اپنانا اور اس پر یقین کرنا کہ فطری طور پر ان کے اندر اختراعی صلاحیت کی کمی ہے، اور قدرت نے ان کے حصے میں یہ دولت کم رکھی ہے بلکہ تقلید ومحاکات اور نقل واتباع ہی ان کا فطری حصہ ہے اور رہی سائنسی تحقیقات، فکری پرواز، ایجاد واختراع تو یہ ایک ہی قوم مغرب کی میراث ہے۔

عزم وحوصلہ اور احساس برتری کی ضرورت

یہ تو واضح طور پر مغرب سے مرعوبیت ہے، غور کرنے کی بات ہے کہ یورپ نے کس سے سیکھا؟ اور مغرب اپنی بیداری سے قبل گمنامی اور جہالت کی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ سوچنا بھی مشکل تھا کہ کبھی یہ پرتیں ہٹیں گی اور یورپ ان سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے گا؟ سطور بالا میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ مغرب کو یہ مقام مسلمانوں نے بخشا، قدرت نے ذہنی ودماغی صلاحیتیں کسی ایک

زمانے یا کسی ایک قوم اور رنگ و نسل یا کسی خاص سرزمین کے بسنے والوں کے لیے مخصوص نہیں کہیں، بلکہ قدرت کا یہ فیض سارے بنی آدم کے لیے عام ہے، اس چھپی ہوئی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف ارادہ اور عزم کی ضرورت ہے:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مغرب کے بارے میں اس تفوق و برتری کا احساس ختم ہونا چاہیے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خود پیش قدمی نہ کرے، اور قافلہ سالار بننے کی کوشش نہ کرے، مسلمانوں کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جس کو مغرب سے پوری واقفیت حاصل ہے اور مغربی علوم پر دسترس رکھتا ہے، موجودہ اجتماعی حالات کی روشنی میں عالم اسلام کے مخصوص حالات وضرورتوں اور اسلامی اقدار و نظریات کی روشنی میں جائزہ لے اور تمام علوم میں بحث و تمحیص کے لیے آمادہ ہو جائے خصوصا نفسیات، اقتصادیات، اجتماعیات، سیاسیات، طبیعیات اور زبان وادب میں پھر ان علوم کو غیر مفید اور غیر ضروری حصے سے علیحدہ کر کے ان کو صحت منداور مفید بنا کر ترقی دے۔

انسانی شرافت وعزت اور آزادی کے حصول اور اسلامی تشخص کے باقی رکھنے اور سامراج کے مقابلے کے لیے یہی بہتر اور صحیح راستہ ہے، اس طرح عصری علوم اور سائنسی تحقیقات، انکشافات وتجربات کے ذریعہ تھوڑے ہی عرصہ میں مغربی سائنسدانوں اور یورپین مفکرین اور دانشوروں کو وہ پورے اعتماد اور پوری قوت سے مخاطب کر سکیں گے، اور یہ کہہ سکیں گے: **"وما اوتیتم من العلم الا قلیلا"** تمہیں تو دریا سے ایک قطرہ ہی ملا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد چنا

مولانا حکیم امیر الدین مہر مرحوم

ممتاز عالم دین مولانا حکیم امیر الدین مہر س14 دسمبر 2020ء کو خالق حقیقی سے جاملے۔ مولانا امیر الدین مہر کی پیدائش 30 ستمبر 1936ء میں متحدہ ہندوستان کے شہر جودھ پور (راجستھان) ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور ان کے خاندان کے کچھ افراد ابھی بھی راجستھان میں رہائش پذیر ہیں۔ سندھ کے اندر جن شخصیتوں نے درس و تدریس، تعلیم و تربیت کے ذریعے جماعت اسلامی کے کام کو دعوتی اور عملی میدان میں آگے بڑھایا، ان شخصیتوں میں ایک شخصیت مولانا میر محمد لاشاری مرحوم تھے۔ مولانا امیر الدین مہر نے ابتدائی تعلیم مدرسہ انوار العلوم پیارو گوٹھ ضلع جیکب آباد میں مولانا میر محمد لاشاری سے حاصل کی، جب کہ فاضل منشی، درس نظامی اور ایم اے جامعہ سندھ سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ مولانا امیر الدین مہر کی تعلیم و تربیت میں بنیادی کردار مولانا علی محمد لاشاری اور نامور مورخ دانشور اور تعلیمی ماہر پروفیسر سید محمد سلیم کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا امیر الدین مہر نے تدریس کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ، ہالا سندھ میں بحیثیت مدرس کیا۔ جہاں پر پروفیسر سید محمد سلیمؒ بحیثیت پرنسپل خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ مولانا امیر الدین مہر نے شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ میں قیام کے دوران مطب بھی قائم کیا جس کی وجہ سے مولانا مہرؒ کو حکیم امیر الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔

مولانا امیر الدین مہرؒ فکری اور نظریاتی طور جماعت اسلامی وابستہ تھے، چوں کہ مولانا کی بنیادی تعلیم مدرسہ انوار العلوم پیارو گوٹھ ضلع جیکب آباد میں نامور عالم دین میر محمد لاشاری

کے ہاں ہوئی جو اس وقت ترجمان القرآن کے قاری تھے اور مولانا مودودی کے لیکچر سے متعارف تھے۔ مولانا علی محمد لاشاری کے تحرک پر ان کے چھوٹے بھائی مولانا میر محمد لاشاری نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا بھرپور مطالعہ کیا اور 1952ء میں چوہدری غلام محمد مرحوم کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہوئے رکن بن گئے اور یہ وہی موقعہ تھا کہ اسی دن اور وقت اپنے استاد مولانا میر محمد لاشاری کی پیروی کرتے ہوئے مولانا امیر الدین مہرؒ بھی 1952ء میں جماعت اسلامی کے رکن بن گئے۔ اسی بنا پر مولانا امیر الدین مہرؒ صاحب جماعت اسلامی کے فکر سے آخر دم تک جڑے رہے۔

مولانا امیر الدین مہرؒ بنیادی طور پر ایک منکسر المزاج، نرم گو اور صلح پسند طبیعت کے مالک، مرنجاں مرنج اور فنا فی التحریک شخص تھے۔ مولانا امیر الدین مہرؒ بڑے عالم دین اور سندھ کے چپے چپے سے واقف تھے۔ آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ دعوت کا کام ہر فرد، ہر قبیلے اور ہر علاقے میں کیا جائے یہی وجہ ہے کہ آپ نے درس وتدریس کے ساتھ تعلیم و تربیت کے حوالے سے اپنے اولین دور سے ہی کام کا آغاز کر دیا تھا۔ مولانا امیر الدین مہرؒ صاحب نے اس دوران وسعت مطالعہ جاری رکھا اور مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھیں۔ نامور داعی اور عالم دین مولانا جان محمد بھٹو مرحوم نے اردو کی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن کا جب سندھی زبان میں ترجمہ شروع کیا اور سورہ یوسف تک ترجمہ کر سکے تو ان کا انتقال ہو گیا۔ تفہیم القرآن کے بقیہ سندھی ترجمے کو مولانا امیر الدین مہرؒ نے نہایت سلیس اور آسان سندھی زبان میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ مولانا امیر الدین مہرؒ کی سندھی زبان میں لاڑی اور ڈھاٹکی لہجے کے اثرات نمایاں تھے، اسی لیے جب مولانا نے تفہیم القرآن کا سندھی میں ترجمہ کیا تو نظر ثانی کے لیے سکھر سندھ کے نامور عالم پروفیسر عبداللہ تنیو کے حوالے کیا، جنہوں نے تفہیم القرآن کے سندھی ترجمے پر نظر ثانی کی۔ مولانا امیر الدین مہرؒ نے تفہیم القرآن کا تین جلدوں میں خلاصے کا بھی سندھی زبان میں ترجمہ کیا جس کو سندھ کی مہران اکیڈمی شکارپور نے شائع کیا اور یہی خلاصہ ایک جلد میں ہندوستان سے بھی شائع ہوا۔ مولانا امیر الدین مہرؒ صاحب نے قرآن مجید

کے علاوہ سیرت النبی، سیرت صحابہ، احادیث اور دوسرے موضوعات پر سندھی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں اور سندھی زبان میں ترجمہ کیں۔

شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ کے قومیانے کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ منصورہ ہالا کی بنیاد رکھی گئی تو ان کے اولین اساتذہ میں بھی مولانا امیر الدین مہر بھی تھے۔ جب دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا قیام عمل میں آیا تو مولانا امیر الدین مہر دعوۃ اکیڈمی کے بنیادی ارکان میں سے نمایاں تھے۔ 1987ء میں دعوۃ اکیڈمی کے سابق ایڈیشنل ڈائریکٹر محمود احمد فاروقی کے تحرک پر مولانا امیر الدین مہر کو دعوۃ اکیڈمی میں اسسٹنٹ پروفیسر تعینات کر کے سندھی شعبے کا سربراہ بنایا گیا، بعد میں مولانا کئی برس تک شعبہ سندھی لٹریچر اور تربیت ائمہ کورس کے انچارج رہے۔ اسلام آباد میں رہتے ہوئے مولانا نے گراں قدر دعوتی کتب کو سندھی زبان میں منتقل کیا۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق صدر اور عالم اسلام کے نامور عالم ڈاکٹر محمود احمد غازی اور نامور دانشور اور مغربی علوم پر دسترس رکھنے والے سابق ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد نے سندھی لٹریچر کی اشاعت میں سرپرستی فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا امیر الدین مہر نے اکیڈمی کی دعوتی، تربیتی اور علمی سرگرمیوں میں نمایاں کام کیا اور انہوں نے دعوۃ اکیڈمی کے سندھی لٹریچر میں تقریباً ساٹھ دینی و دعوتی کتب کا اضافہ کیا۔ مولانا مہر صاحب کو یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ انہوں نے دعوۃ اکیڈمی کے علاقائی مرکز کے قیام کے لیے ابتدائی خاکہ اور سینٹر کے قیام کے لیے اعلیٰ حکام تک منظوری کے مراحل کے لیے کوششیں کیں، یہی وجہ ہے کہ دعوۃ اکیڈمی کا ریجنل سینٹر کا کراچی میں قیام عمل میں لایا گیا اور سندھ اور بلوچستان کے لیے دعوتی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز 2003ء میں ہو گیا۔ سینٹر کی تعمیراتی، انتظامی اور مالیاتی امور دعوۃ اکیڈمی کے اس وقت کے ایڈیشنل ڈائریکٹر محمود احمد فاروقی نے نہایت جان فشانی، خوش اسلوبی اور تیزی سے انجام دیے جبکہ مولانا مہر ریجنل دعوۃ سینٹر کے پہلے انچارج مقرر ہوئے۔

مولانا مہر صاحب نے سندھی اور اردو زبان میں تقریباً تیس کتب لکھی ہیں، جن سے اہل علم اور دعوت کا کام کرنے والے اہل علم استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ مولانا امیر الدین مہر کی

نمایاں کتب میں سے حدیثوں کا مجموعہ "املھ ھیرا"، "املھ مانک" اور "اربعین نووی" نمایاں ہیں جب کہ سیرت النبی ﷺ پر "رحمت ہی رحمت" معارف اکیڈمی کراچی نے شائع کی۔ اس کے علاوہ "خطبات جمعہ"، "گفتگو کا سلیقہ"، "خدمت خلق"، "صحابہ اکرام"، "اصلاح معاشرہ میں مسجد کا کردار"، "تفسیر سورۃ الحجرات"، "تعارف قرآن"، "وادی مہران کی علمی و دعوتی شخصیات" اور "حرمین کا سفر" نمایاں ہیں۔ اسلام میں خدمت خلق کے حوالے سے ان کی ضخیم کتاب "اسلام میں رفاہ عام کا تصور اور خدمت خلق کا نظام" بہت عمدہ اور اعلی درجے کی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا مہر صاحب نے سندھی اور اردو زبان میں تقریباً تیس کتب لکھی ہیں جن سے اہل علم اور دعوت کا کام کرنے والے اہل علم استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ مولانا امیر الدین مہر کی یہ فراخدلی اور دعوت سے لگن تھی کہ انہوں نے اپنے آخری ایام میں کچھ کتب بلا معاوضہ طباعتی اداروں کے حوالے کیں جو کہ شائع ہوئیں۔

راقم کو مولانا کے ساتھ تقریباً دس سال دفتری کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی ساری زندگی جدوجہد اور دعوتی سرگرمیوں میں گزری۔ مولانا امیر الدین مہر کی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کو سکھاتے اور اپنے دل نشین انداز سے علمی کام میں معاونت کرتے۔ ان سے پہلا تعارف غالباً 1995ء میں ہوا جب میں اسلام آباد میں ایک دعوتی تنظیم کے دفتر میں موجود تھا اور مولانا محترم عصر کی نماز کے بعد اپنے حسب معمول سیر کرتے ہوئے دفتر پہنچے۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی جو بعد میں ایک اچھے تعلق میں بدل گئی اور ان ہی کے تحرک پر میں دعوۃ اکیڈمی کا حصہ بن گیا۔ انہوں نے سندھی زبان میں ترجمے کے لیے کئی کتابیں میرے حوالے کیں اور اس حوالے سے رہنمائی کرتے رہے۔ کئی دفعہ کتابوں کا سندھی زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے جب مشکل پیش آتی یا الفاظ کو سمجھنا ہوتا تو ہم دونوں بحث مباحثہ بھی کرتے اور موزوں الفاظ پر اتفاق کرتے مجھے اس دوران یہ کبھی محسوس نہیں ہوا کہ مولانا بہت بڑے اور میں بہت چھوٹا۔ مولانا امیر الدین مہر صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر وقت اور ہر دم مصروف رہا جائے، جب مولانا صاحب دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد سے ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے اپنے استاد نامور مورخ اور عالم پروفیسر سید محمد سلیمؒ کو خط لکھ کر یہ رہنمائی لی کہ مجھے اب

مزید دعوت کا کام کس طرح کرنا چاہیے اور میری مصروفیت کیا ہونی چاہیے؟ مجھے اسلام آباد رہنا ہے یا دعوت کے کام کے لیے سندھ آنا چاہیے؟ اس کے بعد آپ اپنے استاد کے حکم پر اسلام آباد سے جامعہ علوم اسلامیہ منصورہ آئے اور تقریباً دو سال جامعہ منصورہ کے متہم کے فرائض انجام دیے۔ اس کے علاوہ مولانا امیر الدین مہر نے میرپور خاص میں دو دینی مدارس قائم کیے جہاں تعلیم و تدریس جاری ہے۔

مولانا امیر الدین مہر صاحب جب 2008ء میں باقاعدہ دعوۃ اکیڈمی کے علاقائی مرکز کی ذمے داریوں سے بھی فارغ ہوئے تو انہوں نے فارغ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا اور غزالی اکیڈمی میرپور خاص کی بنیاد ڈالی۔ غزالی اکیڈمی میرپور خاص کے تحت انہوں نے سندھی زبان میں ترجمہ قرآن مجید کی اشاعت کی اور اس کو صوبہ سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں مفت پہنچایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سندھی اور اردو میں دعوتی کتابچے/ پمفلٹ کی اشاعت کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے اپنی وفات سے چند سال پہلے قرآن مجید کے حوالے سے "مفردات قرآن" جمع کرنا شروع کیے، یہ علمی کام جاری رہا مگر بدقسمتی سے مکمل نہ ہو سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا امیر الدین مہر نے اپنی ساری زندگی علمی، دینی، اسلامی، دعوتی اور رفاہی کاموں میں وقف کر دی۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان کی اولاد بھی دعوتی کام سے وابستہ ہو جائے، اس کے لیے انہوں نے اپنے پوتے اور نواسے دینی مدارس میں داخل کروائے۔ ماشاءاللہ آج ان کی اولاد حافظ قرآن اور دینی علوم سے بہرہ مند ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مہر صاحب کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

تجدد کے نام پر مغرب کی تقلید کی دعوت

محققین اور اصحاب فکر و نظر کا خیال ہے کہ کسی حقیقت کے بارے میں تسلیم و یقین کے بجائے شک وشبہ مزید علم و تحقیق کا ذریعہ ہے اور اس تلاش و جستجو سے نئے گوشے کھلتے اور نئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں، کیونکہ علم کوئی جامد چیز نہیں ہے جو ہمیشہ یکساں اور ایک حالت پر رہے، بلکہ انسان کی فہم اور اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے، اس کی طبیعت ترقی پذیر ہے، اس میں ہر نئی تحقیق و نظریہ اور فکر سے نئی بات اور نیا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، ایک ہی موضوع پر مختلف انداز اور مختلف زاویہ سے غور کرنے والے الگ الگ نتائج اخذ کرتے ہیں اور مختلف شکلوں میں اس کو پیش کرتے ہیں، اسی لیے رجحانات اور نظریات کے اعتبار سے اختلاف رائے بھی ہوتا ہے، ایک مفکر اور صاحب نظر دوسرے کی فکر ورائے کو بے کم وکاست قبول نہیں کر لیتا، ایک تحریک کا بانی دوسرے قائد اور بانی کے وضع کردہ اصول و تحریک پر کلمہ توحید کی طرح ایمان نہیں لے آتا، اور حقیقت یہ ہے کہ علمی میدان میں اور آج کے سائنسی دور میں نئے نئے انکشافات اور نئی دریافتیں اسی شک وشبہ اور عدم قبول کی دین ہیں، اہل مغرب، سائنس اور تحقیقات کے تقدس پر ایمان نہیں لاتے اور نہ وہ کسی نظریہ کو محض ایک نظریہ ہونے کی وجہ سے بغیر تحقیق کے قبول کرتے ہیں، بلکہ تقلید اور اتباع محض کی سب سے زیادہ انہوں نے مخالفت کی، اور مشرق والوں کے ذہن میں یہ اصول راسخ کر دیا جس پر مشرق کے مغرب زدہ علماء عمل پیرا ہیں، لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ مشرقی سادہ لوح انہی اہل مغرب کی تقلید اور ان کی تحقیقات کے سامنے عقیدتمندی کے اظہار پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مغرب کی کورانہ تقلید

مشرقی قوموں کے نزدیک اہل مغرب کی تحقیقات، بدیہیات سے کسی طرح کم نہیں، چنانچہ عقل و نقل کے درمیان تعارض کے وقت نقل وروایت کو ہفوات و خرافات سمجھ کر نظر انداز کر دیا

جاتا ہے کیونکہ عقل اور سائنس ہی ان کے نزدیک معیار حکمت اور صحیح وصواب کا تھرمامیٹر ہے، لیکن اگر یہی نقل مغربی روایات سے ماخوذ ہو تو ہر طرح قابل ترجیح اور لائق عمل ہو جاتا ہے۔ آج مغربی علوم سیکھنے والے مسلم دانشور اور تہذیب نو کے پروردہ لوگ تہذیب وثقافت میں، علم و تحقیق میں اور سائنسی تجربات میں مغرب کے تقدس مآبی پر ایمان لا چکے ہیں، ان کے نزدیک اہل مغرب سے کسی چیز میں غلطی کیا لغزش اور چوک بھی امکانیات سے بالاتر ہے، خواہ وہ نظریات، مشرقی نظریات، مشرقی قدروں، زندگی کے مشرقی اصول مشرقی طرز فکر اور مشرق کی جغرافیائی خصوصیات سے کتنے ہی مختلف اور متصادم کیوں نہ ہوں اور اہل مشرق کی دینی حمیت وغیرت اور قومی تشخص کے لیے مضر اور مہلک کیوں نہ ہوں، لیکن وہ مغرب کی وفاداری میں ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہیں اور اپنے تمام تشخصات وامتیازات اور قومی وجود سے بہ رضا ورغبت دستبردار ہونے پر آمادہ ہیں، چنانچہ مشرقی انسان اور خصوصا مسلمان جو سیاست وثقافت اور نظریات کے حملوں کا براہ راست نشانہ ہے وہ اہل مغرب کے سامنے ایک سعادتمند شاگرد بن چکا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے استاد مغرب کے نشان قدم پر چلتا ہے، یہ مشرقی انسان اپنے ذاتی جذبات، احساسات وکیفیات اور فکری آزادی سے یکسر محروم ہو چکا ہے کیونکہ وہ اپنے استاد کے کمالات پر یقین کر کے اس کو لغزشوں اور غلطیوں سے ماوراء سمجھنے لگا ہے، وہ پوری طرح مغرب کا ہو چکا ہے، اس کا جسم مشرقی ہے لیکن روح وفکر مغربی ہے، مغرب سے آنے والے علوم وافکار کی عظمت اور ان کے ساتھ عقیدت ونیازمندی کا یہ مزاج عالم اسلام کے دور انحطاط میں سامراجی سائے میں پیدا ہوا۔ سامراجی حکومت میں قائم ہونے والی تعلیم گاہوں اور تربیتی اداروں نے مغربی سیلاب میں آنے والے ہر خس وخاشاک کو لائق صد احترام بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور ذہنوں پر مغربی برتری کا ایسا گہرا اثر ڈالا جو حالات بدلنے کے بعد بھی ذہنوں سے نہیں نکل سکا۔

ذہنی غلامی اب وہ دور گذر چکا، مشرقی قومیں اور خصوصا مسلمان مغربی غلامی سے آزاد ہو گئے ان کی اپنی حکومتیں قائم ہو گئیں جن کی باگ ڈور مشرقی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، ان کے مدارس اور یونیورسٹیاں اور ان کی علمی و تحقیقی اکیڈمیاں قائم ہیں، لیکن مسلمانوں کی اس ترقی کے بعد آج بھی

ان کے اداروں میں، افراد میں جس جوہر اور جس متاع گرانمایہ کی کمی ہے، وہ ہے آزادی فکر، خود اعتمادی، اجتہاد اور اختراع، وہ آج مغرب سے آزاد ہو کر بھی ذہنی غلامی کے شکار ہیں۔ وہ یورپین عینک سے دیکھتے اور اسی کسوٹی پر پرکھتے اور اسی دماغ سے سوچتے ہیں، اصلاح و تربیت کے ذمہ دار معلمین واساتذہ جنہیں نئی نسل کے اندر بلند حوصلگی کی جان ڈالنی چاہئے، قوم کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرنا چاہئے اور ترقی کے لیے نئی راہ بنانے کے لیے تیار کرنا چاہیے، وہ نونہالان قوم کو مغرب کے ساتھ صرف شمولیت اور شریک رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

مغرب سے مرعوبیت

چنانچہ مشرقی انسان نے ترقی کی راہ میں پچھلی صفوں میں رہنا پسند کیا، اور اس دوڑ اور ریس کے زمانہ میں اپنے لیے آخری صفوں کا انتخاب کیا، ہمارا تعلیمی نظام ہو یا سیاسی نظام یا اقتصادی یہاں تک کہ سماجی اور عائلی نظام بھی مغرب کی پیروی اور نقالی کی بنیاد پر قائم ہے اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارا ادب اور تنقیدی قدریں بھی بڑی حد تک مغربی تعلیم کے نتیجہ میں تقلید مغرب کا شکار ہو گئی ہیں، جس کی ہمت و حوصلہ کی انتہائی پرواز تماشائی بننا یا زیادہ سے زیادہ شریک کار رہنا ہو وہ مقابلہ اور پیش قدمی کو کیونکر سوچ سکتا ہے؟ وہ تقلید واتباع اور ذہنی غلامی کی بنا پر فکر و عمل کی آزادی، ایجاد واختراع اور انکشاف ودریافت کے میدان میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے خیال میں قافلہ سالار ہونا اور قائد ورہنما بننا اس کے عبقری استاد مغرب کے سواد وسرے کو زیب نہیں دیتا، ہمارے عصری تعلیم یافتہ طبقے پر اس کورانہ تقلید نے ایسا جادو کیا ہے کہ وہ مشرقی کے کارناموں اور فضل وکمال کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے، ارسطو اور دیگر یونانی فلاسفہ کا ذکر صرف اس بنا پر کرتے ہیں کہ یہ یونانی فلاسفہ، مغرب کے استاد اول ہیں، ورنہ ان کو تو مسلم فلاسفہ کے ذکر سے شرم آتی ہے جو یونانی فلسفہ کے نہ صرف ماہر بلکہ فلسفہ ومنطق میں اعلیٰ مقام اور انفرادیت کے حامل تھے، امام غزالی جیسا عبقری جس نے فلسفہ یونان کی تردید اور جوابات سے اس کی عظیم الشان عمارت کو متزلزل کر دیا، اور امام رازی جنہوں نے فلسفہ کا طلسم توڑ کر رکھ دیا اور مولانا جلال الدین رومی، ابن خلدون اور دیگر علماء مصلحین کی طرف انتساب کو یہ لوگ اپنے لیے عار سمجھتے ہیں، اور اس کو قدامت پسندی سے تعبیر

کرتے ہیں، لیکن حیرت ہے کہ ان حکمائے اسلام سے صدیوں قبل پہلے سے یونانی فلاسفہ، ارسطو، جالینوس وغیرہ کی طرف نسبت کو یہ ترقی اور تجدد کی علامت قرار دیتے ہیں۔

اور سب سے زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تحقیق وریسرچ کرنے والے مسلمان، اسلامیات کے سلسلے میں مستشرقین پر اعتماد کرتے ہیں اور اسلامی علوم وفنون میں مستشرقین کی تشریحات اور تصنیفات ان کے لیے مرجع اور مآخذ ہوتی ہیں اور وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ کہاں کہاں ان مستشرقین نے غلط بیانی سے کام لیا، اور کہاں کہاں اپنے قاری کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، اور کس طرح بے بنیاد باتوں کا سہارا لے کر ایک مضبوط اور پختہ بنیاد پر قائم اسلامی پر شکوہ عمارت کو ڈھانے کی کوشش کی۔

صلیبی روح اور عناد

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے مرکز بغداد واندلس کے زمانۂ عروج میں یورپ اپنے انتہائی تاریک دور سے گذر رہا تھا اس وقت وہاں کلیسائی ظلم عام تھا اور علمی خزانے کئی تالوں میں بند تھے، مسلمانوں کے علمی مزاج، آزادئ فکر اور فراخ دلی نے ان علوم کو عام کیا، اور بغداد واندلس کے عہد انحطاط سے یورپ میں بیداری پیدا ہوئی، یورپ نے مسلمانوں سے تہذیب وثقافت لی اور حکمائے اسلام ابن سینا وفارابی سے فلسفہ ومنطق سیکھا، لیکن یورپ اپنے عناد، قومی غرور اور اسلام دشمنی کی بنا پر مسلمانوں کا منت کش نہ ہوا، مغرب کے دل میں اس کی بیداری کے روزِ اول سے ہی صلیبی جنگوں کی وجہ سے اسلام دشمنی کے شرارے روشن تھے، یورپ نے مسلمانوں سے علوم حاصل کرنے کے وقت بھی خود کو مسلمانوں کا ممنون کرم نہیں سمجھا اور نہ تقلید واتباع کے لیے تیار ہوا، یورپ کا دل مسلمانوں کی طرف سے کبھی صاف نہیں رہا، اس کی دماغی صلاحیت مسلمانوں کے خلاف مصروف کار رہی، تمدن وتہذیب، حکومت وسیاست اور علم وفن کی گرم بازاری میں بھی مسلمانوں سے مقابلہ اور آزادی کے جذبات نے ان کے اندر روح کو سرگرم عمل رکھا، اور وہ تدریجا آگے بڑھتے رہے، بالآخر اپنی علمی مہارت وکمال کے ذریعہ بولتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانی طبیعت کے مطابق نئے نئے نظریات اور تصورات قائم کیے اور انہی نظریات وفلسفات کے ذریعہ مسلمانوں پر

حملہ آور ہوئے اور انہوں نے اپنا تشخص نظر انداز نہ کیا اور نہ اپنی مذہبی انفرادیت، بلکہ عصبیت اس علمی و ثقافتی استفادہ کے باوجود کم نہ ہونے دی جو مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات سے ظاہر ہے۔

نقل و تقلید کا طوق

اس طرح مغرب، بہت کم وقت میں شاگردی کے دور سے گذر کر استادی کے مرحلہ میں داخل ہو گیا، اور آج کے مسلمان جنہوں نے عصری علوم حاصل کیے، مغربی دانشوروں کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا اور اسلامی ملکوں میں کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں، علمی و فکری میدان میں روز افزوں ترقی کرتے رہے، لیکن ان مراحل سے گذر کر ترقی کے اس طویل ترین عبوری دور کے بعد آج تک وہ مغرب سے علیحدہ نہ ہو سکے، وہ نقل و تقلید کا طوق ڈالے رہے، اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے اور ابتکار و اختراع کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر سکے، تہذیب و ثقافت علم و فن، تحقیقات و نظریات اور تمدن و سیاست ہر میدان میں خود کفیل ہونے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی قوم تا آنکہ وہ تقلید کا طوق نہ اتار پھینکے فکر و نظر کا دروازہ اس کے لیے کھل نہیں سکتا، فکری و نظری سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور وہ قوم فکری طور پر بانجھ ہو جاتی ہے، عصر حاضر کے مسلمانوں کے مغرب سے بچھڑ جانے کی سب سے بڑی وجہ ان صلاحیتوں کے بارے میں اپنے اندر منفی پہلو اپنانا اور اس پر یقین کرنا کہ فطری طور پر ان کے اندر اختراعی صلاحیت کی کمی ہے، اور قدرت نے ان کے حصے میں یہ دولت کم رکھی ہے بلکہ تقلید و محاکات اور نقل و اتباع ہی ان کا فطری حصہ ہے اور رہی سائنسی تحقیقات، فکری پرواز، ایجاد و اختراع تو یہ ایک ہی قوم مغرب کی میراث ہے۔

عزم و حوصلہ اور احساس برتری کی ضرورت

یہ تو واضح طور پر مغرب سے مرعوبیت ہے، غور کرنے کی بات ہے کہ یورپ نے کس سے سیکھا؟ اور مغرب اپنی بیداری سے قبل گمنامی اور جہالت کی پرتوں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ سوچنا بھی مشکل تھا کہ کبھی یہ پرتیں ہٹیں گی اور یورپ ان سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے گا؟ سطور بالا میں یہ بات کہی جا چکی ہے کہ مغرب کو یہ مقام مسلمانوں نے بخشا، قدرت نے ذہنی و دماغی صلاحیتیں کسی ایک

زمانے یا کسی ایک قوم اور رنگ و نسل یا کسی خاص سرزمین کے بسنے والوں کے لیے مخصوص نہیں کہیں، بلکہ قدرت کا یہ فیض سارے بنی آدم کے لیے عام ہے، اس چھپی ہوئی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف ارادہ اور عزم کی ضرورت ہے:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مغرب کے بارے میں اس تفوق و برتری کا احساس ختم ہونا چاہیے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خود پیش قدمی نہ کرے، اور قافلہ سالار بننے کی کوشش نہ کرے، مسلمانوں کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جس کو مغرب سے پوری واقفیت حاصل ہے اور مغربی علوم پر دسترس رکھتا ہے، موجودہ اجتماعی حالات کی روشنی میں عالم اسلام کے مخصوص حالات و ضرورتوں اور اسلامی اقدار و نظریات کی روشنی میں جائزہ لے اور تمام علوم میں بحث و تمحیص کے لیے آمادہ ہو جائے خصوصا نفسیات، اقتصادیات، اجتماعیات، سیاسیات، طبیعیات اور زبان و ادب میں پھر ان علوم کو غیر مفید اور غیر ضروری حصے سے علیحدہ کر کے ان کو صحت مند اور مفید بنا کر ترقی دے۔

انسانی شرافت و عزت اور آزادی کے حصول اور اسلامی تشخص کے باقی رکھنے اور سامراج کے مقابلے کے لیے یہی بہتر اور صحیح راستہ ہے، اس طرح عصری علوم اور سائنسی تحقیقات، انکشافات و تجربات کے ذریعہ تھوڑے ہی عرصہ میں مغربی سائنسدانوں اور یورپین مفکرین اور دانشوروں کو وہ پورے اعتماد اور پوری قوت سے مخاطب کر سکیں گے، اور یہ کہہ سکیں گے: **"وما اوتیتم من العلم الا قلیلا"** تمہیں تو دریا سے ایک قطرہ ہی ملا ہے۔

مولانا سید عنایت اللہ ندوی

ہندستاں میں انتہا پسند ہندو تنظیم کی سرگرمیاں

آر ایس ایس ایک ہندو انتہا پسند تنظیم ہے جس کی جڑیں کافی پھیل چکی ہیں اور اس کے شعلے اب ہندوستان کے کونے کونے کو اپنی لپیٹ میں لیتے چلے جارہے ہیں، ابھی اس کے قیام کو سو سال بھی پورے نہیں ہوئے پھر بھی وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقتور منظم ترین تنظیم بن چکی ہے، اس لیے اس کا جائزہ لینا انتہائی ضروری ہو چکا ہے۔

آر ایس ایس کا قیام ۱۹۲۵ء کو ہوا جبکہ ہندوستان میں آزادی کی تحریک عروج پر تھی، مہاتما گاندھی کی قیادت میں سارے باشندگانِ وطن متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف ملک گیر اندولن چلارہے تھے، ہندو مسلم اتحاد کے بے نظیر مناظر سے انگریزوں کے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آرہی تھی، اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے انگریزوں نے جہاں بہت ساری منصوبہ بندیاں کیں، ان میں سے ایک آر ایس ایس کا قیام بھی ہے، اس کے لیے انہوں نے ایک ۲۵ سالہ نوجوان کا انتخاب کیا جس کی پیدائش ناگپور میں ہوئی تھی، اور وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کلکتہ گیا تھا، کلکتہ میں تعلیم کے دوران اس کی پوری ذہن سازی کی گئی، مسلمانوں کے خلاف اس کے دل ودماغ میں زہر کوٹ کوٹ کر بھرا گیا اور اس کے لیے تیار کیا گیا کہ وہ خالص ہندوؤں کی ایسی تنظیم تیار کرے جو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہو اور مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر ہندوستان میں ہندو راشٹر قائم کرے، وہ نوجوان تھا کیشو بلی رام ہیڈگیوار، یہی وہ نوجوان تھا جس نے ناگپور آکر آر ایس ایس کی بنیاد ڈالی، آر ایس ایس کے بنیادی مقاصد یہ قرار دیے گئے:

۱۔ تمام ہندو ذاتوں کو ایک پلیٹ فارم میں جمع کرنا۔

۲۔ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرنا۔

۳۔ ہندوستان کی سرزمین سے مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کی منصوبہ بندی کرنا۔

۴۔ آزاد ہندوستان میں ہندو راشٹر قائم کرنا جس کی بنیاد منو سمرتی پر ہو۔

ان مقاصد کو ہندوتو کا نام دیا گیا پھر اس ہندوتو کو بروئے کار لانے کے لیے ہیڈ گیوار نے زبردست حکمت عملی اختیار کی، سب سے پہلے مرحلے میں ناگپور شہر میں تربیتی کیمپس بنائے گئے جن کو آر ایس ایس کی شاکھائیں کہا گیا، ان شاکھاؤں میں ۲۰ سال سے ۳۰ سال کے ہندو نوجوانوں کو داخل کر کے انکی تربیت اس انداز میں کی گئی کہ وہ ہندوتو کے نظریہ کے علمبردار بن جائیں، پھر آہستہ آہستہ ان شاکھاؤں کو ناگپور کے علاوہ مہاراشٹر کے دیگر شہروں میں پھیلایا گیا، نیز اسی طرح ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی اس کی شاکھائیں پھیلتی گئیں، ان شاکھاؤں میں داخل ہونے والوں کو فوجی ٹریننگ نظم وضبط کے ساتھ ساتھ توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ کے طریقے بھی سکھائے گئے، شاکھاؤں سے نکلنے والے افراد سیاست، صحافت، انتظامیہ وغیرہ مختلف شعبوں میں داخل ہوتے گئے اور ہر جگہ وہ ہندوتو کی ترویج کرنے لگے، اس کے ساتھ ساتھ آر ایس ایس نے ۷۰ کے قریب ذیلی تنظیمیں بھی تشکیل کی ہیں جو آر ایس ایس کے ماتحت رہ کر مختلف میدانوں میں ہندوتو کو فروغ دینے کا کام منظم ڈھنگ سے کرتی ہیں، ان ذیلی تنظیموں میں اہم ترین تنظیمیں یہ ہیں: ۱۔ بھارتیہ جن سنگھ، ۲۔ بجرنگ دل، ۳۔ وشو ہندو پریشد، ۴۔ اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد، (abvp) ۵۔ بھارتیہ کسان سنگھ، ۶۔ بھارتیہ مزدور سنگھ، ۷۔ اکھل بھارتیہ شکشکھ، مہاسنگ وغیرہ وغیرہ، ان ساری تنظیموں کو سنگھ پریوار کہا جاتا ہے۔

بھارتیہ جن سنگھ اب بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) میں تبدیل ہو چکی ہے، یہ دراصل آر ایس ایس کی سیاسی جماعت ہے جو سیاسی میدان میں آر ایس ایس کے ایجنڈے اور ہندوتو کے فارمولے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مؤثر طور پر سرگرم ہے، یہ فی الحال دنیا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن چکی ہے جس کے ممبران کی تعداد پندرہ کڑور سے زیادہ ہو چکی ہے، کانگریس کو بے دخل کر کے ہندوستان کے اقتدار پر بھی اس نے قبضہ کر لیا ہے، اور مسلسل چھ سال سے اقتدار پر قابض ہے، ہندو راشٹر کے قیام کے لیے اپنے اقتدار کا بھرپور استعمال بھی کر رہی ہے،

اس سلسلے میں اس کی موجودہ سرگرمیوں کا جائزہ بعد میں لیں گے، ابھی صرف آر ایس ایس کی کچھ ذیلی تنظیموں کا مختصر تعارف پیش کر رہے ہیں۔

آر ایس ایس کی ایک اہم ذیلی تنظیم بجرنگ دل بھی ہے جو دراصل ایک فوجی یونٹ ہے، اس کے سرگرم ارکان کی تعداد تیس ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے، بجرنگ دل کے ارکان ہر طرح کی فوجی، جنگی ٹریننگ سے آراستہ ہیں، کراٹے، جوڈو، لاٹھی، تلوار زنی، تیراندازی، پتھر بازی، بندوق فائرنگ، بمباری، بم سازی، توڑ پھوڑ، آگ زنی، ہر طرح کی جنگی صلاحیت سے مالا مال ہیں، پولیس اور فوج سے بھی ٹکرانے کی اہلیت رکھتے ہیں، یوپی اور دہلی کے حالیہ دنگوں میں انہوں نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے بھی دکھادیا ہے، یہ تنظیم طاقت و قوت کا استعمال کر کے دہشت گردی کے ذریعہ آر ایس ایس کے ایجنڈے کو نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

وشو دہندو پرشد (VHP) بھی آر ایس ایس کی ایک ذیلی تنظیم ہے، اسکے سرگرم کارکنوں کی تعداد ۷۰ لاکھ کے قریب ہے، اس تنظیم کا اصل کام آر ایس ایس کے لیے رقوم کا فراہم کرنا ہے، اس کے ارکان اندرون ملک اور بیرون ملک میں بسے ہوئے مالدار ہندوؤں سے رابطے کر کے ان کے دل و دماغ میں اس بات کو بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بڑے خطرات لاحق ہیں، اس لیے آر ایس ایس کو مالی اعتبار سے مضبوط کیا جائے تاکہ وہ بہتر طریقے سے ہندوؤں کی حفاظت کر سکے، نیز مؤثر طریقے سے مسلمانوں کا صفایا کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکے، اس مہم میں وی ایچ پی بہت حد تک کامیاب ہو چکی ہے، اس کی کوششوں سے آر ایس ایس دنیا کی مالدار ترین تنظیم بن چکی ہے اور اسکی شاکھائیں تیس سے زیادہ ملکوں میں قائم ہو چکی ہیں، اس کی بہت بڑی کامیابی بابری مسجد کو شہید کروانے اور اس کی جگہ پر مندر بنوانے کے لیے سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے سلسلے میں ظاہر ہو گئی ہے، آر ایس ایس نے اس کام کی ذمہ داری وی ایچ پی کے سپرد کی تھی، جس میں اس نے مکمل کامیابی حاصل کر لی۔

آر ایس ایس کی ایک طاقتور ذیلی تنظیم اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد (abvp) بھی ہے جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تنظیم ہے، یہ تنظیم فی الحال ہندوستان کی سب

سے بڑی طلبہ کی تنظیم بن چکی ہے جس کے ارکان کی تعداد ۳۸ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے، ہندوستان کی ہی یونیورسٹی اور کالج میں یہ تنظیم فعال اور سرگرم ہے، ساتھ ہی بہت ساری دہشت گردانہ کاروائیوں میں بھی یہ ملوث رہتی ہے، خاص طور پر حالیہ دنوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طلبہ پر دہشت گردانہ حملوں میں واضح طور پر اس تنظیم کے ارکان ملوث رہے ہیں، اس تنظیم کے ذریعہ آر ایس ایس نوجوان طلبہ کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا زہر گھولنے کا کام کرتی ہے۔

آر ایس ایس کی بنائی ہوئی ایک ذیلی تنظیم بھارتیہ کسان سنگھ بھی ہے جو کسانوں اور کاشتکاروں کی تنظیم ہے، اس تنظیم کے تحت ملک کے اسی لاکھ کسان جڑ چکے ہیں، اس تنظیم کے ذریعہ آر ایس ایس کسانوں میں ہندوتو نظریے کو پھیلا رہی ہے، اسی طرح بھارتیہ مزدور سنگھ کے نام سے آر ایس ایس کی ایک ذیلی تنظیم ہے، ملک کے ایک کروڑ مزدور اس تنظیم کا حصہ بن چکے ہیں، اس کے ذریعہ مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور میں بھی آر ایس ایس اپنا زہر پھیلا رہی ہے، مختلف اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے اساتذہ میں نفرت کی بیج بونے کے لیے آر ایس ایس نے ایک ذیلی تنظیم اکھل بھارتیہ شکشک مہاسنگھ کے نام سے بنائی ہے جس کے ارکان کی تعداد ۱۸ لاکھ تک پہنچ چکی ہے، اس تنظیم کے ارکان کے ذریعہ طلبہ میں مسلمانوں کے خلاف زہر گھولنے کا کام کیا جارہا ہے۔

آر ایس ایس کی کل ۷۰ ذیلی تنظیموں میں سے صرف ۷ کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ کتنا وسیع اور گہرا ہو چکا ہے۔

ان تنظیموں کے قیام کے ساتھ ساتھ آر ایس ایس نے پرائمری سے لے کی یونیورسٹی سطح تک بہت سارے تعلیمی ادارے بھی ملک بھر میں قائم کیے ہیں، اپنا ایک نصاب بھی بنایا ہے جس میں تاریخ کے اندر زبردست چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے، ہندوستان کے اندر آٹھ سو سالہ مسلم دور کا نام تک نہیں لیا ہے، لیا بھی ہے تو انتہائی سیاہ باب کے طور پر، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ

مسلمان حملہ آوروں نے ہندوؤں کا قتل عام کروایا، انہیں زبردستی مسلمان بنایا، مندروں کو مسمار کیا، ظلم و بربریت کا ننگا ناچ کرتے رہے وغیرہ وغیرہ۔

تعلیمی اداروں کے اعتبار سے آر ایس ایس کے کئی نیٹ ورک کام کرتے ہیں:

ا۔ ایکل ودیالیہ کے نام سے آر ایس ایس نے دیہاتوں اور قبائلی علاقوں میں ۹۶ ہزار ایسے مفت تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں جن میں ۲۶ لاکھ بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں سے ہر اسکول میں صرف ایک ہی استاد رکھا گیا ہے جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو قصوں، کہانیوں ڈراموں اور گیتوں کے ذریعہ ہندوتو کی تعلیم دیتا ہے اور آر ایس ایس کے نظریہ کی طرف مائل کرنے کے لیے انکی ذہن سازی کرتا ہے۔

۲۔ ودیا بھارتی یا سرسوتی شیشو مندر کے نام سے ملک بھر میں ۲۴ ہزار ۳۹۶ ایسے اسکول آر ایس ایس نے قائم کیے ہیں جن میں ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان اسکولوں میں پرائمری سے لے کر ہائی اسکول تک کی تعلیم دی جاتی ہے، ۹۳ ہزار اساتذہ ان میں تعلیم دیتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اسی ادارے کے تحت ۱۲۵۰ انٹرمیڈیٹ کالج، ۱۵ ٹریننگ کالج، ۱۲ ڈگری کالج اور اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی کام کر رہے ہیں، فی الحال آر ایس ایس کا یہ تعلیمی نیٹ ورک ہندوستان کا سب سے بڑا پرائیویٹ اسکول نیٹ ورک بن چکا ہے، ان تعلیمی اداروں کو چلانے کے لیے رقوم برطانیہ، امریکہ، امارات وغیرہ میں مقیم ہندوؤں سے حاصل کی جاتی ہیں، اب جبکہ مختلف ریاستوں اور مرکز میں بی جے پی کی حکومتیں قائم ہوگئی ہیں تو ان حکومتوں کی طرف سے بھی ان اداروں کو رقوم فراہم کی جاتی ہیں۔

اب بات کرتے ہیں آر ایس ایس اور اسکے سیاسی بازو بی جے پی کے اس دوسرے رخ کی جس کا تعلق تحریک آزادی اور ہندوستانی آئین سے ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ آر ایس ایس کا قیام چونکہ انگریزوں اور انگریزی حکومت کے اشارہ پر ہوا تھا، اس لیے آر ایس ایس نے تحریک آزادی کی ہر سرگرمی سے اپنے آپ کو مکمل طور پر دور رکھا بلکہ بسا اوقات اس تحریک کی مخالفت اور انگریزی حکومت کی برملا تائید بھی کی جس کی واضح مثال یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب مہاتما

گاندھی کی طرف سے انگریزی حکومت کے خلاف ستیہ گرہ تحریک کا اعلان کیا تو آر ایس ایس کے بانی و سربراہ ہیڈ گیوار نے صاف لفظوں میں اس کی مخالفت کی اور ملک میں موجودہ آر ایس ایس کے ورکروں کو اس تحریک میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے باقاعدہ ایک سرکولر جاری کیا، چنانچہ جس آزادی کی تحریک میں ہندوستان کا بچہ بچہ شامل ہوا، اس سے آر ایس ایس کے لوگوں نے اپنے آپ کو الگ رکھا، یہ دراصل انگریزوں کو خوش کرنے کی پالیسی تھی تاکہ انگریزی حکومت سے جو حمایت آر ایس ایس کو مل رہی تھی وہ آئندہ بھی جاری رہے، اس طرح آر ایس ایس نے آزادی کی تحریک سے ہمیشہ اپنے آپ کو پوری طرح الگ رکھا۔

اسی طرح ہندو مسلم دو قومی نظریہ کی آواز بھی پہلی مرتبہ آر ایس ایس کی طرف سے آئی، آر ایس ایس نظریے کے ایک بہت بڑے علمبردار ساورکر نے ۱۹۳۷ء میں پہلی بار دو قومی نظریہ پیش کرتے ہوئے ہندوستان کو ہندو لینڈ اور مسلم لینڈ کی حیثیت سے دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی، اس کے ۳ سال کے بعد مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں اسی تجویز کو قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے الگ ملک پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا، اس طرح ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد آر ایس ایس کی طرف سے ڈالی گی جس کی تکمیل مسلم لیگ نے کر دی۔ مہاتما گاندھی اور پوری کانگریس پارٹی اسکے خلاف تھی، انگریز وہی چاہتے تھے جو آر ایس ایس چاہتی تھی، چنانچہ آر ایس ایس کی تجویز کے مطابق ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو کر آزاد ہوا، آزادی کے فوراً بعد آبادی کی منتقلی شروع ہوئی، ہندوستان سے مسلمان پاکستان کی طرف اور پاکستان سے ہندو ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے لگے، اسی دوران آر ایس ایس کے غنڈوں نے ملک بھر میں مسلمانوں کا قتل عام، غارت گری اور لوٹ مار شروع کر دی، مہاجرین کو پاکستان کی طرف لے جانے والی ٹرین کے اندر گھس کر سارے مسلمانوں کو قتل کر ڈالا، جب ٹرین پاکستان پہنچی تو پوری ٹرین مردہ لاشوں سے بھری ہوئی تھی، اس کے بعد نہرو لیاقت سمجھوتہ ہوا جس کے تحت یہ طے پایا کہ آبادی کی منتقلی کا سلسلہ روک دیا جائے، جو جہاں ہیں وہیں کا شہری بن کر رہیں گے لیکن آر ایس ایس نے ملک کے اندر قتل

وغارت گری کا سلسلہ جاری رکھا، ہزاروں مسلمان مختلف شہروں اور دیہاتوں میں روزانہ قتل ہوتے رہے، مہاتما گاندھی نے قتل وغارت گری کو روکنے کی اپیل کی، اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تو انہوں نے مون برت رکھا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک یہ قتل وغارت گری کا سلسلہ نہیں رکتا میں نہ تو کچھ کھاؤں اور نہ پیوں گا، اس مون برت کے بعد مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ رکا، اس طرح آر ایس ایس کا پلان ناکام ہو گیا، اس کا پلان یہ تھا کہ اگر ملک کی تقسیم ہندو مسلم کی بنیاد پر ہو گی تو ہندوستان کی سرزمین سے سارے مسلمانوں کو نکال کر اسے مسلم مکت ملک بنایا جا سکتا ہے جس کو ہندو راشٹر بنانا ممکن ہو سکے گا، تقسیم تو ہو گئی لیکن نہرو لیاقت سمجھوتے سے مسلمانوں کے نکالنے کا راستہ بند ہو گیا، اب آر ایس ایس والوں نے قتل عام کے ذریعہ مسلمانوں کو ختم کرنے کی مہم چھیڑ دی لیکن گاندھی جی کے مون برت سے یہ مہم بھی ناکام ہو گئی، اب انہوں نے مہاتما گاندھی ہی کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا، اس کے لیے انہوں نے دو نوجوان ناتھورام گوڈسے اور نارائن آپٹے کو منتخب کیا، یہ دونوں پائجامہ کرتا ٹوپی لگا کر مسلمانوں کا بھیس بنا کر نئی دہلی میں واقع برلا ہاؤس پہنچے جہاں مہاتما گاندھی قیام پذیر تھے، ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو شام کے وقت جب وہ پرارتھنا کرنے جا رہے تھے تو راستہ میں ناتھورام گوڈسے سامنے آیا، اس نے مہاتما گاندھی کا پیر چھوا، پھر اٹھ کر ایک پستول سے مہاتما گاندھی کے سینے پر تین گولیاں داغ دیں، موقع ہی پر گاندھی جی کا انتقال ہو گیا، ان دونوں کو موقع ہی پر لوگوں نے پکڑ لیا، اسلامی لباس سے پہلے مرحلہ پر لوگوں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں مسلمان ہیں، فوری طور پر ویڈیو سے خبر نشر ہو گئی کہ ایک مسلمان نے گاندھی جی کو قتل کر دیا، اس خبر کے نشر ہوتے ہی بمبئی و دیگر شہروں میں پھر سے مسلمانوں کے خلاف حملے شروع ہو گئے، اسی اثناء میں مہاراشٹر پونے کے ایک ہندو ممبر پارلیمنٹ وہاں آ گئے اور انہوں نے گوڈسے کو دیکھا تو پہچان گئے اور انہوں نے کہا کہ یہ تو ناتھورام گوڈسے ہے جو میرے محلہ کا ہے اور آر ایس ایس کا غنڈہ ہے، پھر تحقیق ہوئی تو بات صحیح نکلی، رات کے بارہ بجے وزیر اعظم نہرو ریڈیو پر آئے اور انہوں نے باضابطہ اعلان کیا کہ مہاتما گاندھی کا قاتل آر ایس ایس کا رکن ناتھورام گوڈسے ہے، اس کے بعد مسلمانوں پر حملے رکے، یہاں بھی

آر ایس ایس کی ایک بہت بڑی سازش بے نقاب ہوئی اور ناکام ہوئی، آر ایس ایس کی سازش یہ تھی کہ گوڈسے اسلامی لباس میں گاندھی کو قتل کر کے فرار ہو جائے گا اور قاتل کی شناخت ایک مسلمان کی حیثیت سے ہو گی تو ہندوستان میں باپو کے چاہنے والے مسلمانوں کا چن چن کر قتل کر ڈالیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ سازش ناکام کر دی۔

مہاتما گاندھی کے قتل میں شامل ہونے کے پختہ ثبوت کی بنا پر ۲۶ فروری ۱۹۴۸ء کو آر ایس ایس پر پابندی لگا دی گئی، آر ایس ایس کے کارکنوں اور لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا لیکن اس وقت کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے ۱۲ جولائی ۱۹۴۹ء کو آر ایس ایس سے پابندی ہٹالی، پابندی ہٹنے کے بعد اسکے سارے کارکنوں اور لیڈروں کو رہا کر دیا گیا، اس کے بعد بہت تیزی کے ساتھ پورے ملک میں آر ایس ایس نے اپنے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیے، اگر پابندی برقرار رکھی گئی ہوتی تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا جو آج دیکھا جا رہا ہے، ملک کو آزادی دلانے والے عظیم انسان باپو کے قتل میں واضح طور پر ملوث آر ایس ایس کو اس ملک کے اندر اپنی سرگرمیاں چلانے کی قطعی اجازت نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن سردار پٹیل کی کرم فرمائی تھی کہ انہوں نے سارے کانگریسیوں کی مخالفت کے باوجود آر ایس ایس سے پابندی ہٹالی اسی لیے آر ایس ایس ان کو اپنا محسن اعظم مانتی ہے، اسی احسان کے بدلے میں بی جے پی نے انکا ایک دیو ہیکل مجسمہ بنا کر کھڑا کر دیا، جب پابندی لگی تھی اس وقت تو آر ایس ایس والے گوڈسے سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتے نہیں تھکتے تھے لیکن آج وہ اسکو اپنا بہت بڑا ہیرو مانتے ہیں۔

۱۹۵۰ء ۲۶ جنوری کو ملک کا آئین نافذ ہوا جس میں بھارت کو جمہوری سیکولر ملک قرار دیا گیا اور ملک کے لیے تین رنگوں والا جھنڈا متعین کیا گیا، آر ایس ایس والوں نے کبھی بھی دل سے نہ اس آئین کو تسلیم کیا اور نہ جھنڈے کو، ان کے نزدیک وہ فارمولہ ہی ہندوستان کا آئین بن سکتا ہے جسے وہ ہندوتو کا نام دیتے ہیں اور جس کی بنیاد منوسمرتی پر ہے اور ان کے نزدیک بھگوا جھنڈا ہی مقدس ہے جس کو وہ سینہ سے لگاتے ہیں چنانچے عرصہ دراز تک انہوں نے ملک کے جھنڈے کو

اپنے دفتروں میں کبھی بھی آویزاں نہیں کیا، صرف بھگوا جھنڈا ہی لہراتے رہے، اب چند دنوں سے بھگوا جھنڈے کے ساتھ ملک کے جھنڈے کو لہرانے لگے ہیں۔

ملک کے آئین میں یہاں بسنے والے ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، بدھسٹوں، دلتوں، آدیواسیوں اور کمیونسٹوں کو مساوی حقوق دیے گئے ہیں جبکہ آر ایس ایس کا نعرہ ہے: ہندی ہندو ہندوستان، نہ رہے سکھ نہ مسلمان۔ اور اسکے ایجنڈے میں سر فہرست مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنا ہے، مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر ہی وہ یہاں ہندو راشٹر قائم کر سکیں گے کیونکہ وہ مسلمانوں کو اس راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں، مسلمانوں کو ہندوستان سے کس طرح نکالا جائے اس کے لیے آر ایس ایس نے اپنے ماہرین کی ایک ٹیم بنائی جس کے ذمے یہ کام سونپا کہ ایسے ملکوں اور علاقوں کا جائزہ لیا جائے جہاں سینکڑوں سالوں تک مسلمانوں نے حکومت کی پھر وہاں سے کس طرح مسلمانوں کو چن چن کر نکال دیا گیا پھر اسی طریقہ کار کو ہندوستان میں استعمال کرے، یہاں سے مسلمانوں کے وجود پر تیشہ چلایا جاسکے، اس فہرست میں سب سے پہلا خطہ یورپ کا ملک اسپین نظر آیا، چنانچہ آر ایس ایس کے تجربہ کار ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم باقاعدہ اسپین گئی اور بہت گہرائی سے ان تمام تفصیلات کو جمع کیا جن کو استعمال کر کے وہاں سے مسلمانوں کو مکمل صفایا کیا گیا تھا، جب انہوں نے محسوس کیا کہ اسپین کا تجربہ کامیاب نہیں ہو پائے گا تو پھر اسرائیل کا رخ کیا جہاں سے فلسطینی عربوں کو نکال کر یہودیوں نے اسرائیلی مملکت قائم کی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

علمی طبقات کے کرنے کا کام

اس وقت علماء اور تعلیم یافتہ طبقے کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقے کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں، اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں، ہوتے ہیں تو اس میں سنجیدگی، گہرائی اور پختگی ہوتی ہے، اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی، اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہوگی، اس میں عامیانہ اور متبذل انداز نہیں ہوگا، اس وقت عالم اسلام میں علماء کی اور دینی جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، یہ ذمہ داری ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے، لیکن اس زمانے میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے، اور تحریکِ دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے، اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم ہونے نہ دیں گے کہ دریا کا حباب ہے، بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم و دین کی زمین میں پیوست ہیں۔

مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ

خلافتِ بنی امیہ و خلافتِ بنی عباس کی پشت پر اگر علماء و مجتہدین نہ ہوتے تو اسلام بہ حیثیت نظام حیات کے ایک مرتب و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات کو سراہا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں، ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روزِ روشن کی طرح تابناک ہیں، لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے، اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے، وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے، نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے، ان میں رہنمائی کرتے تھے، ان کی

خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، حالانکہ اگر ائمۂ مجتہدین، محدثین عظام اس زمانے میں نہ محنت کرتے، اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی، اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم ونسق قائم کرتی تھی، تو یہ سب کوششیں، فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھوکھلی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کو زیر وزبر کر ڈالا، عالم اسلام کی چولیں ہلا دیں، اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، آپ اس زمانے کی تصاویر دیکھیں جو آثار قدیمہ میں ملتی ہیں، تو ان سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی داڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے، اور ایک تاتاری اسے کھینچے لیے جارہا ہے، دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے، لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا، اور خاص طور پر اس خطۂ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا مرکز رہ چکا تھا، یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ، جو آخر میں فقہ کا (خاص طور سے فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے، لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ وہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام کے مفتوح بن گئے، اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے، مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمانوں کے علم نے مسخر کر لیا، اور ان کو اپنا بے دام غلام بنالیا، بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب ووسیع قانون نہ تھا، ان کا ایک سیدھا سادہ روایتی قانون تھا، جو قبائلی زندگی میں رائج تھا، اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا عمل دخل تھا، نیم وحشی اقوام میں جیسے ''عُرف'' ہوتے ہیں، وہ ویسے تھے، ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی، مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار میں پہنچے تو ان کی علمیت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا، اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری من حیث القوم مسلمان ہوگئے، مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے، ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی

یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشکلات ومسائل کو حل کر سکتے تھے، تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی، فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء، جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان، اور ہمارے قانون داں اور ہمارے ادیب ودانشور طبقے کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا یہ، یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کی نگرانی کر سکتا ہے کہ یہ تمدن بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ تاثیر علمائے دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے، اور یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہو جائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے، بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے، اور جہالت سے اس کو فائدہ، تو خواہ تھوڑے عرصے کے لیے اپنے زور شمشیر، اپنے بازو سے وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصے پر قبضہ کر لے، لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہو سکتا، سب یہی خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے جہالت کی تاریکی چاہیے، جب تک وہ تاریکی رہے گی، وہ زندہ رہے گا، اور جب علم آئے گا وہ غائب ہو جائے گا، اس کا پردہ چاک ہو جائے گا، اور جس طرح بدلی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے، اسی طرح وہ چھٹ جائے گا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خالص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر تو آئی، حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا، ان کی مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت رہنمائی کرتی رہی، لیکن اس کے بعد پھر اس کو ایک زمانے تک ذہین اور صاحب نظر

لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لیے زندگی سے اس کو علاوہ کر لینا چاہیے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی

یورپ اس وقت ترقی کر رہا تھا، یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے، یورپ میں تنازع للبقاء کے لیے سخت کشمکش تھی، ان کی پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہو جاتی، عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی، جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ تشریح، نہ اس کے پاس آئین تھا، آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت پر کرتی تھی، مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی، شریعت موسوی تھی، جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی ''ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم'' (سورۃ آل عمران: ۵۰) کہا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لیے مستقل شریعت لے کر آیا، تو جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہو گئی تھیں، مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی، اس کے پاس مستقل کوئی آئین نہیں تھا، اور اس کا زیادہ تر زور رحم پر، محبت پر، انسان دوستی پر، مظلوموں کی شفقت پر، اجارہ اداری اور اس کے غرور کو ختم کرنے پر تھا، جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں جو زندگی کے لیے دوڑ رہی تھیں، مچل رہی تھیں، عیسائیت پہنچی، تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو گئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانے، دوڑتے ہوئے معاشرے اور ابلتے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی وقت مسیحی علماء کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور رہنما اصول دیتے، زمانے کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہیے، یہ انہوں نے نہیں کیا، وہ دو گروہوں میں بٹ گئے، حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا، اور باقی زندگی کو، آئین کو، آئین سازی کو کھلی چھوٹ دے دی، دوسرا طبقہ علماء کا تھا، انہوں نے مخالفت شروع کر دی اور کہا: ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے، کلیساؤں میں جانے میں، جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں، ازدواجی زندگی سے

منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے، اور اسی میں روحانیت کا بچاؤ ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا، جو حاکم طبقہ تھا، اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا، جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا، اس نے مسیحیت کو بدنام کیا، سینٹ پال کے زمانے سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور یہ تقریبا چوتھی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے، یورپ اسی راستے پر گامزن ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا، کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لیے جدائی ہو گئی، اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہو گئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ

یہ غلطی عالم اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی، اس لیے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا، میں نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی ''اقرا'' کے لفظ سے شروع ہوئی ہو، اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو، وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دین و علم میں کبھی بھی دوری ہو گی، اس لیے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔

اسلام زمانے کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہ نما ہے

اس وقت عالم اسلام میں اہل علم کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نوجوان طبقے میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم رہ سکتا ہے، وہ زمانے کی تبدیلیوں اور علم و فن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ اس زمانہ میں چلنے والی چیز نہیں، وہ ابتدائی سادہ اور محدود زمانے کا ساتھ دے سکتا تھا، جب انسانیت عہد طفولیت میں تھی، لیکن اس

پُر پیچ، ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، سب سے بڑی خدمت علماء کی یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں اس چیلنج کو قبول کرتے، اور اپنی ذہانت سے، گہرے مطالعہ سے، اصولِ فقہ سے کام لینے کی صلاحیت سے، کتاب وسنت کے ان ازلی اور لافانی اصولوں کی مدد سے جو ہر زمانے میں نسل انسانی کی رہنمائی کر سکتے ہیں، اس تمدن کو اسلام کے اصولوں کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے، اس میں اگر کسی ملک میں ذرا بھی کچھ کمی ہوگی، اس کا نتیجہ کم سے کم جو ہو سکتا ہے، وہ بے عملی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے، اور بڑے سے بڑا نقصان جو ہو سکتا ہے وہ الحاد اور دین سے بغاوت ہے، کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرا نتیجہ ظاہر ہوا، اور کسی اسلامی ملک میں دیکھیں گے کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا، حالانکہ دونوں نتیجے اسلام کے حق میں سم قاتل ہیں، سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی روح اور مقاصد کے ساتھ اور اپنے انہیں اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے، بلکہ رہنمائی کر سکتا ہے، ساتھ دینا تو میں نے علی سبیل التنزل کہا، وہ تو بہت ہی گھٹیا درجہ ہے، یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے، نہیں، بلکہ وہ نئی زندگی کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کو خطروں سے صرف وہی بچا سکتا ہے، اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجیے

علماء اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارے، ہر مدرسے اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا، اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا، تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس وپیش نہیں ہونا چاہیے، ہمیں دین وملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا

چاہیے، سہرا کسی کے سر بندھے سہرا ہونا چاہئے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معجزہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک مجلس میں واقعے کے طور پر ذکر کیا کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں گئے تھے، وہاں ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، ہم نے چیتھڑے لپیٹ لیے، اسی وجہ سے وہ غزوۂ ذات الرقاع کہلاتا ہے، یہ کہنے کے بعد ان کو ایک دم سے یہ احساس ہوا کہ میں نے یہ کیوں کہا، کہیں میرا یہ عمل باطن نہ ہو گیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں نے سن لیا، اور بڑا مجاہد سمجھا، یہ کافی ہے، اب ہم سے کیا لینے آئے ہو؟ تو بخاری شریف میں خاص طور سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ کاش میں یہ نہ کہتا، ان کو اس کا افسوس رہا۔ (بخاری، حدیث:۴۱۲۸) آج اس پر زیادہ زور ہے کہ یہ کارنامہ کس کی طرف منسوب ہوگا، ایک صاحب تھے غازی محمود دھرم پال، مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آگیا، ایک تقریر میں کہنے لگے: اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں صاحب کے دستِ حق پرست پر اسلام لایا، تاکہ اس کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان کے دستِ حق پرست کی بھی شہرت ہو جائے، بلکہ دستِ حق پرست کی شہرت زیادہ منظور ہے، قبولِ اسلام کی شہرت ہو یا نہ ہو، یہاں تک کہ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا جنازہ ہوتا ہے، لپک کر پہنچ جاتے ہیں جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے، اس لیے کہ اخبار میں کل یہ خبر چھپ جائے گی، یہ جذبہ بڑا نقصان پہنچاتا ہے، دیکھیے جب کسی کا عزیز جاں بلب ہوتا ہے، تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو، سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے، حکیم کے سر سہرا بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اس وقت عالم اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے، آپ اس وقت بھول جائیے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا، اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ، فلاں جماعت سے پہنچا، اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا، تاتاریوں کے بارے میں آج تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے

میں سب سے بڑا حصہ کسی کا تھا، اس لیے کہ ان مخلصین نے جنہوں نے یہ خدمت انجام دی تھی، اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بیں نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جارہی ہے، اس ملک کو اسلامی آئین دینے کی، اسلامی معاشرت وتمدن میں ڈھالنے کی، اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کردی ہیں، اس لڑائی میں فوج کے ادنی سپاہی بن جائیں، خالص اللہ کی رضا کے لیے کام کیجیے، اللہ کے یہاں آپ کا نام اس کے نورانی دفتر میں لکھا جائے گا، یہاں ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا، اس وقت لڑائی کسی مکتب خیال کی نہیں ہے، اس وقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے، اس طرح سمجھئے کہ ایک مسجد تعمیر ہورہی ہے، اس میں جو بھی شریک ہوجائے سب اجر میں شریک ہوں گے، اس میں یہ کس کا کتنا حصہ ہے اور کس کا نام پہلے ہے، اور کس کا نام بعد میں ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے، اس جذبہ کو جہاں تک ہوسکے مغلوب کرنا چاہیے، اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہیے، جسے ہم حق سمجھتے ہوں اس کو حق سمجھنا چاہیے، اس سے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے، سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن سب دعوتِ اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں، اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جاسکے اور یہ ملک دوسروں کے لیے نمونے بنے۔

ایثار وقربانی

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی ہوسکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز کریں، ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی، اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا، سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے، ہماری آپس کے دینی مباحث کا میدان اور ہے، اس کے کہنے کا موقع اور ہے، حضرت مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لیے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا، اگر کوئی مسئلہ چھڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ پکے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں، اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ

ہمارے وزراء، ارکانِ سلطنت اور خالص دنیادار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے، جب حضرت مجدد صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لیے رکھے، تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار! خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے، یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی، جو انہوں نے اس بات کو سمجھا، میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہر حال ہر شخص کو حق ہے، ایک بچہ بھی خطرے کا اظہار کرسکتا ہے کہ وہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے چور نہ آجائے، اس طرح میں یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یہ تاثر نہ لینے دیں کہ کتاب وسنت اور اس کی تشریحات میں فقہ کا اور اصول فقہ کا جو ذخیرہ ہے، وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا، موجودہ مسائل حل نہیں کرسکتا، یہ خیال بڑا خطرناک ہے، یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں، یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے، وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کررہے ہیں، یہ نہیں کہ آپ چاہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں، اور جو تنخواہیں وزراء کو مل رہی ہیں، اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں، وہ ہم کو بھی حاصل ہوں، ہماری کیڈلک کار ہو، ہمارے پاس بھی کوٹھی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم نہ ہو، بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کہ کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کرسکتا ہے، اس لیے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بہ تکلف بوریہ نشین بنے، میں اس کی تعلیم نہیں دیتا، لیکن یہ واقعہ ہے، یہ طبقہ اسی کے سامنے آکر جھکتا ہے اور مانتا ہے جس کو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے، حضرت مجدد (رحمۃ اللہ علیہ) کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لیے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے، بیٹھا

اللہ اللہ کرتا ہے، بیٹھے بیٹھے مشورہ دیتا ہے، ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا، کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے، مگر دور سے نگرانی کرتے رہے، حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے، دعا کرتے، ان کے حق میں مشورہ دیتے رہے، لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے، اگر ہاتھ ڈال دوگے تو جل جاؤگے۔

یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں، سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس وقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالم اسلام کا امتحان ہے، ہمیں اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیے، کہیں ہماری صلاحیت کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے، کوئی یہ نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے یہ ہوا، میں اتنی باتیں بہت معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

شمس الحق ندوی

مصیبتوں اور مشکلات سے

صلاحیتوں کا ابھرنا

انسان کے لیے مصیبتوں اور پریشانیوں سے زیادہ بڑی اور تکلیف پہنچانے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصیبت ہی کا کڑوا گھونٹ انسان کی وہ تربیت کرتا ہے جو اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، چنانچہ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ مغرور سے مغرور انسان بھی جب مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو ہوش میں آجاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لیے مصیبت کی آگ میں تپا کے اور غم ورنج کی گھاٹیوں سے گذارنے کا تربیتی نظام رکھا ہے، کبھی کبھی مصیبتوں ہی کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت ونعمت اور کامیابی ومسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب کی ترشی ہی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا ہو اور دولت وثروت پر کتنا نازاں ہو، لیکن جب وہ کسی آفت ومصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو فوراً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگدستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی، ان سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست انسان بھی چونک کر ہوشیار ہو جاتا ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے برے اعمال اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ تھوڑی سی تکلیف سے بندے میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بہت قیمتی چیز ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان حالات سے گذارتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا: ''لقد خلقنا الانسان فی کبد'' (تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں)۔

یعنی آدمی ابتداء سے انتہا تک مشقت ورنج میں گرفتار ہے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتا رہتا ہے، شاید عمر بھر میں کوئی ایسا لمحہ آتا ہو جب کوئی انسان تمام قسم کے خرخشوں اور محنت وتکلیف سے آزاد ہو کر بالکل بے فکری کی زندگی گذارے، مکی زندگی میں اللہ کے رسول صلی اللہ

علیہ وسلم ابتلا وآزمائش کے جس دور سے گذرے ہیں، وہ ''لقد خلقنا الانسان فی کبد'' کا کھلا ثبوت ہے، رنج وغم، بیماریوں اور مصائب سے رجوع وانابت کی وہ حالت پیدا ہوتی ہے جو اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، اس لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر وقت کی دعائیں بتائی ہیں کہ عبدیت کا وہ مظاہرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانے کے بغیر نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیے، یہ دنیا کی مختصر زندگی میں آخرت کی دائمی زندگی کے لیے تربیت کا خدائی نظام ہے، چنانچہ میدان عرفات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو ہر دیکھنے والے سے زیادہ خدا کی عظمت وجلال کو دیکھ رہے ہیں اور جو ہر جاننے والے سے زیادہ انسانوں کی درماندگی، بے حقیقی اور بے بسی سے واقف ہیں، کیسی پر تاثیر دعا فرماتے ہیں، پڑھئے:

''اللھم انک تسمع کلامی، وتری مکانی، وتعلم سری وعلانیتی، لایخفی علیک شیء من امری،وانا البائس الفقیر،المستغیث المستجیر، الوجل المشفق، المقر المعترف الیک بذنبی، اسالک مسئلة المسکین،وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل، وادعوک دعاء الخائف الضریر دعاء من خضعت لک رقبة وفاضت لک عبرته، وذلّ لک جسمه، ورغم لک انفه، اللھم لاتجعلنی بدعائک شقیا وکن لی روفا رحیما یاخیر المسئولین ویا خیر المعطین۔'' _(اے اللہ !تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناجو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بے کس سوال کرتے ہیں، تیرے سامنے گڑگڑاتا ہوں جیسے گناہگار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے رہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہوئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہے، اے تو اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ، میرے حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہو جا، اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر اور دینے والوں سے اچھے)۔

شمس الحق ندوی

بندہ مؤمن کا نصب العین

یہ دنیا کوئی خودرو جنگل نہیں بلکہ یہ اس مالی کا لگایا ہوا راستہ باغ ہے جس نے عالم کو وجود بخشا ہے، انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے، یہ پھول جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے، بے مقصد نہیں کہ مل دل کر رہ جائے، انسان کے جوہر انسانیت کی اس کے خالق کے سوا کوئی قیمت نہیں لگا سکتا، اس کے اندر وہ لامحدود مطلب، وہ ہمت، وہ بلند پرواز روح اور وہ مضطرب دل ہے کہ ساری دنیا مل کر اس کی تسکین نہیں کر سکتی، اس کے لیے غیر فانی زندگی اور ایک لامحدود دنیا درکار ہے، جو آخرت کہلاتی ہے، جس کے سامنے یہ زندگی ایک قطرے کی بھی حیثیت نہیں رکھتی، وہاں کی راحت کے سامنے یہاں کی راحت اور وہاں کی تکلیف کے سامنے یہاں کی تکلیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے انسان کا فطری تقاضا خدائے واحد کی عبادت، خودشناسی، رضائے الٰہی کی طلب اور اس کے لیے محنت اور فکر وکوشش ہے، اس لیے انسان کو کسی جاہ وعزت، کسی طاقت وقوت اور عظمت وبڑائی کے سامنے بندوں کی طرح جھکنے اور سبزہ کی طرح پامال ہونے کی ضرورت نہیں، وہ صرف ایک بلندی کے سامنے سب سے زیادہ پست اور پستوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بلند ہے، وہ سارے عالم کا مخدوم اور ایک ذات کا خادم، اس کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرا کر اس کو اللہ کے سوا ہر ایک کے سجدہ سے منع کر کے ثابت کر دیا کہ کائنات کی تمام طاقتیں جن کے فرشتے امین ہیں، اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور اس کا سر صرف خدا کے سامنے جھکا ہوا ہے۔

اس کے گلے میں محکومی کی ایک بوجھل زنجیر ضرور ہے مگر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی بہت سی لگی زنجیریں نہیں، وہ ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہے اس لیے کہ اس کے ایک ہی حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے، وہ دوستوں سے محبت رکھتا ہے، کیونکہ اس کو رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ سچے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے، اپنے وہ ہر بڑے اور بزرگ کا ادب کرتا ہے

کیونکہ آداب آموزِ حقیقی نے ایسا بتلایا ہے، اس کو حاکموں کی بھی اطاعت کرنے (ان باتوں میں جو خلافِ شرع نہ ہوں) کا حکم ہے۔ فی الحقیقت اس دنیا میں ہر انسان کے لیے بے شمار حاکم اور اپنے سامنے جھکانے والی قوتیں موجود ہیں جن کی طرف انسان کے ازلی دشمن شیطان نے انسانوں کو جھکایا، اور اپنے ساتھ جہنم میں لے جانے کی راہ پر لگایا ہے، لیکن مومن کے لیے صرف ایک ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں، وہ صرف اسی کے سامنے جھکتا ہے اور صرف اسی کو مانتا ہے، اس کی پیشانی کے جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے، یہی خلاصۂ ایمان واسلام ہے جس کی ہر مومن و مسلم کو قرآن نے تعلیم دی ہے، فرمایا: **''ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ''** (حکومت نہیں کسی کی سوائے اللہ کے اس نے فرمادیا کہ نہ پوجو مگر اسی کو)۔

مومن کا اپنے رب سے رشتہ محض قانونی اور عقلی رشتہ نہیں جس کا دائرہ صرف واجبات ادا کرنے اور احکام کی تعلیم کرنے تک محدود ہو کہ اس کو اس کا کچھ بدلہ مل جائے، یہ محبت اور پاکیزہ جذبات کا بھی رشتہ ہے، یہ ایسا رشتہ ہے جس پر ذوق وشوق، عشق ومحبت، دل سوزی وبے قراری کا غلبہ ہو اور اس طرح ہو کہ غم محبت کے آنسوؤں سے دامن تر ہو:

نہ آنکھوں سے لگتی جھڑی آنسوؤں کی
جو غم کی گھٹا دل پہ چھائی نہ ہوتی

بندۂ مومن اپنے خالق کا محبوب ہے، اس نے فرمایا: **''لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب مؤ من''** (میرے لیے زمین وآسمان کی وسعت بھی کافی نہیں، لیکن میں اپنے بندۂ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں)۔ خالق کی محبوبیت دلانے والی کچھ صفات ہیں جو بندۂ مومن کا اصل سرمایہ ہیں جو اس کو قرآن وحدیث سے حاصل ہوتی ہیں کہ قرآن وحدیث مسلمان کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں جن سے ہر دور میں طاقت اور روشنی حاصل کی جاسکتی ہے اور جن کے ذریعے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچے میں روح پھونکی جاسکتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ

قاصدِ روم اور حضرت عمرؓ

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں قیصر روم نے اپنا سفیر مدینہ منورہ میں بھیجا۔ قاصد نے دار الخلافہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر لوگوں سے خلیفہ وقت کے محل کا پوچھا کہ وہ کہاں ہے تاکہ میں اپنا مال واسباب وہاں تک پہنچاؤں۔

قوم گفتندس کہ او را قصر نیست
مر عم را قصر جان روشنے ست

قوم نے کہا: ہمارے بادشاہ کا کوئی محل نہیں۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کا محل تو ان کی جانِ پاک ہے جو اللہ تعالیٰ کے تعلق خاص اور تجلیات قرب سے منور ہو رہی ہے، جس نے انہیں سارے جہان کے شاہی محلات سے مستغنی کر دیا ہے۔

قاصدِ روم نے دل میں سوچا، یہ کیسا بادشاہ ہے، جو عام لوگوں میں رہتا ہے۔ اس کا کوئی حفاظتی دستہ ہے نہ رہنے کے لیے کوئی عالیشان محل۔ راستے میں ایک اعرابی خاتون سے خلیفہ کا پتا پوچھا تو اس نے کہا ''آپ قبرستان کے پاس ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔''

قاصد جب وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حضرت عمر بے خوف وخطر زمین پر آرام فرما رہے ہیں، نہ تخت وتاج پاس ہے اور نہ ہی فوج ولشکر۔ قریب پہنچ کر جب اس نے آپ کے چہرۂ مبارک کی زیارت کی تو آپ کی ہیبت سے وہ کانپنے لگا، اور اپنے دل میں کہنے لگا:

''میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو دیکھا ہے، اور ایک عمر تک سلطانوں کا ہم نشین رہا ہوں، مجھے کبھی کسی سے خوف تک محسوس نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اس شخص کی ہیبت سے میرے اوسان کیوں خطا ہو گئے ہیں! اس سوئے ہوئے اکیلے آدمی کو دیکھ کر میرا جسم کانپ رہا ہے۔ اس مرد گدڑی پوش کی ہیبت نے تو میرے ہوش اڑا دیئے ہیں۔

بے سلاح ایں مرد خفتہ بر زمیں
من بھفت اندام لرزاں چیست ایں

یہ شخص بغیر کسی ہتھیار کے اور بغیر کسی فوجی پہرے کے زمین پر اکیلا سویا ہوا ہے۔ مجھ پر ایسا لرزہ طاری ہے کہ اگر مجھے سات جسم اور عطا ہو جائیں تو اس لرزے کا تحمل نہ کر سکیں۔ پھر وہ دل میں سوچنے لگا۔

ھیبت حق است ایں از خلق نیست
ھیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

یہ رعب و ہیبت اس گدڑی پوش کی نہیں ہے، دراصل یہ اللہ کی ہیبت ہے کیونکہ اس گدڑی پوش بادشاہ کا قلب اللہ کے قرب اور معیتِ خاصہ سے مشرف ہے۔ پس یہ اسی معیت حق کا رعب وجلال ہے جو اس مرد حق کے چہرے سے نمایاں ہو رہا ہے۔'' قاصد انہی باتوں میں کھویا ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھ کھل گئی۔

سفیر روم نے آگے بڑھ کر بڑے ادب کے ساتھ آپ کو سلام کیا۔ آپ نے نہایت شفقت سے سلام کا جواب دیا، سفیر کو اپنے پاس بٹھا کر تسلی دی اور قیصر روم کا پیغام وغیرہ لینے کے بعد آپ دیر تک اس کے ساتھ معرفت کی باتیں کرتے رہے۔

قاصد روم آپ کے اخلاق حسنہ اور سادگی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے دل سے کفر وشرک کا زنگ دور ہو گیا۔ یہ قاصد حضرت عمرؓ کی صحبت کے فیض سے مشرف بہ اسلام ہو کر باطنی دولت سے مالا مال ہو گیا۔

ھر کہ ترسد از حق وتقوی گزید
ترسد ازوے جن وانس وھر کہ دید

مولانا روم فرماتے ہیں:

''جو اللہ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اس سے جن اور انسان سب ڈرتے ہیں، اور جو بھی اس کی طرف دیکھے گا اُس پر اس مرد حق کی ہیبت غالب ہو گی۔''

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

درسِ حیات: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان کا مقام و مرتبہ بلند فرما دیتا ہے۔